راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 19واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ : عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
(غالب)

جنوری 2017ء

زندگی تھوڑی بچی ہے، اس لیے زیادہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مشکور حسین یادؔ

بھارت سے ہجرت کے وقت گھر کے 35 افراد میں سے میں اکیلا زندہ بچا، گاندھی گورے چٹے آدمی تھے

نامور شاعر، ادیب، صحافی اور وزیر اعظم محمد نواز شریف کے اُستاد سے عامر بن علی اور سید امبر زیدی کی بے لاگ گفتگو

مشکور حسین یادؔ اردو شعر و ادب کا ایک ناقابل فراموش حوالہ ہیں۔ ساٹھ سے زائد کتابوں کے مصنف۔ تمام زندگی حرفوں کی تخلیق اور تدریس میں گزاری ہے۔ صحافت سے ان کی وابستگی بہت پرانی ہے۔ جب پاکستان بنا تو اس وقت 1947 میں بھی ایک سرکاری اخبار کے اڈیٹر تھے۔ ربع صدی گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھایا، جہاں سے ان کے شاگرد ہر شعبہ زندگی میں گئے۔ ان کے شاگردوں میں وزیر اعظم پاکستان سمیت بہت سے وزراء اور اہم حکومتی و غیر حکومتی افراد شامل ہیں۔ گزشتہ دنوں ہم نے لاہور کے علاقے ظفر کالونی میں ان کی رہائش گاہ پر ارژنگ کے قارئین کے لیے ایک انٹرویو کیا۔

ارژنگ: ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے؟

مشکور حسین یادؔ: میرے والد صاحب پولیس میں تھے۔ یہ 1925ء کی بات ہے جب ان کی تعیناتی ضلع

حصار کے علاقے بھٹنڈا میں تھی تو وہیں موضع منڈی ڈوالی میں میری پیدائش ہوئی۔

ارژنگ: تعلیم کا ابتدائی سلسلہ بھی وہیں شروع ہوا؟

مشکور حسین یادؔ: ابتدائی تعلیم تو والد صاحب کی سرکاری نوکری کی تعیناتی کے ساتھ چلی۔ سکول میں داخلہ دوسری جماعت میں لیا تھا، اس کے بعد سکول تو تبدیل ہوتے رہے مگر سب سرکاری سکول ہی تھے جن میں میں نے تعلیم حاصل کی تھی۔

ارژنگ: آپ نے بتایا کہ والد صاحب پولیس میں تھے۔ پھر آپ کا ادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟

مشکور حسین یادؔ: میرے نانا اچھے خاصے ادیب اور توانا شاعر تھے۔ میرے خیال میں شاید ننھیال کی طرف سے یہ چیز آئی ہے۔ مگر میرے دادا بھی ایسے ہی

بقیہ اندرونی صفحات

ماوری افاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ

ارژنگ

لاہور

جلد نمبر 19 جنوری 2017ء شمارہ 1

مدیرِ اعلیٰ ⊙ عامر بن علی

مدیر ⊙ حسن عباسی

{ مجلسِ ادارت }

ڈاکٹر صغرا صدف ⊙ ابرار ندیم ⊙ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

⊙ سید اسد رضوی ⊙ سعدیہ تبسم (برطانیہ)

{ مجلسِ مشاورت }

محمود شفیق اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ⊙ ظفر خان (امریکہ) ⊙ ارشد ندیم ساحل (جاپان)

محمد ادریس لاہوری (جاپان) ⊙ ناز اوکاڑوی ⊙

کمپوزنگ و ڈیزائننگ: 0321-4736769 زرِ کارہ قمران حسن: 0333-4818383

کمپیوٹر گرافکس ⊙ محمد احسن گل: 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 المیزان سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 ناز اوکاڑوی: 0301-4492133

nastalique766@gmail.com

قیمت فی شمارہ 100 زرِ سالانہ بذریعہ ایزی پیسہ بھیجنے کے لیے

Hassan Mahmood - ID.No 31204-7296386-9 - Cell: 0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

پاکستان (بذریعہ ڈاک) 1000 روپے • ڈاک خرچ بیرونِ ملک 5000 روپے

رابطہ: 0300-4489310 - 0331-4489310

فہرست

حمد و نعت ۲

مضامین:

○ اسلم کولسری……ایک تابندہ شاعری رخصتی / عامر بن علی ۴

○ جدید روحی کے نقش و نگار / ڈاکٹر مختار عزمی ۶

○ علی رضا کی ثنائے سرور / ریاض ندیم نیازی ۹

○ ڈاکٹر محمد افتخار شفیع کی تحقیقی اور تنقیدی جہات / اللہ یار ثاقب ۱۱

○ "ریت میں ناؤ" کے افسانوی مجموعے میں دردانہ نوشین خان کی معاشرتی عکاسی ۱۹

○ حسن عباسی کی نظم کا فنی تجزیہ / نازیہ نیازی ۲۱

○ ہندی اور اردو عروض کا تقابلی مطالعہ / وجاہت تبسم ۲۲

○ مبشر سعید……فطرت کا نمائندہ / یاسر رضا آصف ۲۶

○ ترکی کا سفر مبارک / ڈاکٹر طارق ہاشمی ۲۸

○ قتیل شفائی / عطاء الحق قاسمی ۳۰

○ بحری قزاق / احمد سعید ۳۱

○ ہندی اور اردو عروض کا تقابلی مطالعہ / وجاہت تبسم ۲۲

شاعری (غزل، نظم) ۳۳

سفرنامہ:

○ کورل آئی لینڈ کے ساتھ ایک شام / ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ۳۷

افسانے:

○ بے جان پیادہ / ایوب صابر ۳۹

○ قسمت کا پھیر / سعدیہ بتول ۴۴

شعری گوشے: جعفر حسن، عمران مفتی، زاہد محمود شمس، ڈاکٹر وقار خان سیدہ رباب حیدر، ۳۶ تا ۵۰

○ بقیہ انٹرویو / منظور حسین یاد / ادریس لاہوری ۵۰-۵۳

مختصر ادبی خبریں ۵۴

تبصرۂ کتب ۵۶

نامہ ہائے احباب ۵۹

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد،نعت

حمد

اس نے صد شکر کہ اثبات میں رکھا ہوا ہے
مجھ کو مصروف مناجات میں رکھا ہوا ہے
وہی دیتا ہے اندھیروں میں اُجالوں کی نوید
جس نے خورشید کو ظلمات میں رکھا ہوا ہے
جس قدر ظرف ہے اتنا ہی دیا ہے اس کو
اس نے ہر شخص کو اوقات میں رکھا ہوا ہے
ظلمت و نور میں رکھا ہے تفاوت جس نے
اس نے اک ربط بھی دن رات میں رکھا ہوا ہے
زندگی بھی تو امانت ہے اسی کی آخر
موت کو جس نے مری گھات میں رکھا ہوا ہے
وہی بے حوصلہ ہونے سے بچاتا ہے مجھے
جس نے انسان کو خطرات میں رکھا ہوا ہے
تہی داماں ہوں تہی دست نہیں ہوں خورشید
اس نے اک وصف مرے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

نبیؐ کی یاد میں جب آنکھ روئی
خوشی کا مل گیا پیغام کوئی
یہ ادنیٰ معجزہ ہے مصطفیٰؐ کا
جگا دی جس کی قسمت پھر نہ سوئی
چلے طیبہ سے جب، اُلفت نبیؐ کی
لپٹ کر جالیوں سے خوب روئی
ہے سب دکھ بلالؓ مصطفیٰؐ نے
مگر ایمان کی دولت نہ کھوئی
کرم ہو اے شہنشاہؐ مدینہ
کہ دنیا میں نہیں پرنمؔ کا کوئی

پرنم الہٰ آبادی (مرحوم)

این و آں کے سب خزانے دولت و جنت ملی
آپؐ کے قدموں میں جس کو آپ کی صحبت ملی
کر دیے ہیں غم غلط سب آپ کے افکار نے
مطمئن ہیں جسم و جاں، وہ آپ کی رحمت ملی
آپ کی نوری جھلک شادابیاں برسا گئی
خواب خوش! مژدہ تجھے دارین کی لذت ملی
خفتہ و بے حال انساں کیا سے کیا ہوتے گئے
چشم دل اُن کی کھلی، کیف آفریں حیرت ملی
اُن کے صدقے خاک کو کیا دلکشا پیکر ملا
عشق کی قوت ملی، ایمان کی دولت ملی
گل فشانی دیگر اصناف سخن میں بھی ہوئی

سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال

شواہد ہیں کہ یوم الدین کو محشر بپا ہوگا
شفاعت آپ کی ہوگی تو منظر خوش نما ہوگا
جہانِ آب و گل کو آپؐ نے تسخیر کر ڈالا
جہانِ آخرت بھی آپ کے دم سے سجا ہوگا
سرِ تسلیم جھک جائے انھی کے نام ہو جائے
تو پھر ہر کام میں رحمت کا جاری سلسلہ ہوگا
اگر نقشِ قدم مولاؐ کا ہو پیش نظر اپنے
حیاتِ جاودانی کو رواں ہر راستہ ہوگا
ضمیر کن فکاں ہیں، یقیں، ہر دم نبی ہوں گی
تصور آپؐ ہی کا گر دلوں میں جاگتا ہوگا
ریاضؔ اُن کی ثنا گوئی سے میں یہ فیض پاؤں گا
مرے ہونٹوں پہ محشر میں بھی اُن کا تذکرہ ہوگا

سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال

صد شکر مرحت مجھے روشن زبان ہے
ورد زبان آپؐ کا حُسن بیان ہے
طغیانِ بے اماں سے سفینہ نکل گیا
منسوب اُن کے نام سے جو بادبان ہے
اُن ہی کے دھیان میں ہوئی حرم نشاں حیات
کنج دلِ حزیں میں کھلا گلستان ہے
خوشبو میں بس گئیں دلِ زندہ کی دھڑکنیں
گونج اُٹھا ذکرِ پاک سے سارا جہان ہے
فرحت نصیب آپؐ کا ذکرِ جمیل ہے
غارت گرِ طلسم غم رائیگان ہے
توصیف مصطفیٰؐ ہی ریاضؔ کمال ہے
تقلید آپؐ ہی کی تو رفعت نشان ہے

سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال

ظلمت دہر میں روشنی آپؐ سے
گلشن فکر میں تازگی آپؐ سے
پھول حق و صداقت کے مہکا دیے
اہل دنیا نے لی راستی آپؐ سے
ہر طرف تھی تکلف کی جادوگری
ہر نظر کو ملی سادگی آپؐ سے
تیرہ و تار شب میں پریشان تھی
کہکشاں بن گئی زندگی آپؐ سے
پھر رہے ہیں ضیا ڈھونڈتے اہل فن
میری نعتوں میں ہے دل کشی آپؐ سے
فکر مدحت میں اکثر شب تار میں
مانگ لی دلربا چاندنی آپؐ سے

نہ درد و رنج و الم سے گراں بار تھی
زندگی کو ملی سرخوشی آپؐ سے

گوہر ملسیانی/خانیوال

مشتاق دید کو ترے درشن کی آرزو
لے آئی پاس روضۂ اقدس کے روبرو
باطل میں اور حق میں کریں کیسے امتیاز
لازم ہے جانشین محمدؐ کی جستجو
جبریلؑ بام سدرہ سے آگے نہ جا سکے
عرش بریں پہ آپؐ نے کی حق سے گفتگو
مدح نبیؐ اک ایسا عمل ہے پئے نجات
کرتے ہیں جس کی اہل قلم دل سے آرزو
تو نغمۂ حیات ہے تو وجہ کائنات
تجھ سے ہی لامکاں سے جڑے ہیں یہ چارسو
معراج سے حضورؐ جو آئے ہیں لوٹ کر
اب کیجیے مشاہدۂ حق کی گفتگو
منصورؔ گر نصیب مرا یاوری کرے
مداحِ رسولؐ میں ہو جاؤں سرخرو

مظفر حسن منصور/خوشاب

پیکرِ مصطفیٰؐ ہے نظر میں
چاندنی سی ہے قلب و جگر میں
غنچے غنچے میں بوئے نبیؐ ہے
رنگ اُنھی کے ہیں شام و سحر میں
ہر نگر میں ہے ذکر اُن کا جاری
ہر زمانہ ہے اُن کے اثر میں
بام و در مہکے مہکے رہیں گے
پڑھتے رہیے درود اپنے گھر میں
راستے اُجلے اُجلے ملیں گے
سرزمینِ نبیؐ کے سفر میں
باریابی انہیں بھی ہو آقاؐ
التجائیں ہیں جو چشم تر میں
رچ گیا ہے کرم انؐ کا راشد
نعت کہنے کے میرے ہنر میں

محمد ممتاز راشد، دوحہ قطر/لاہور

کائنات آپؐ کی ہے، دست کرم آپؐ کا ہے
ہم غلاموں کا وسیلہ ہے تو دم آپؐ کا ہے
میری آنکھوں میں جو رقصاں ہے طلب آپؐ کی ہے
میرے دل میں جو مچلتا ہے وہ غم آپؐ کا ہے
منزلیں بانٹتے پھرتے ہیں جدھر سے گزریں
عرش بھی چومے جسے نقش قدم آپؐ کا ہے
جستجو اب کسی محبوب کی عالم کو نہیں
مرکزِ چشم دو عالم تو حرم آپؐ کا ہے
آپؐ کی ذات ہے توقیر بشر کی معراج
عزت ارض و سماوات جنم آپؐ کا ہے
جگمگاتا ہوا رہتا ہے مرا فہم و شعور
پردۂ ذہن پہ یوں نام رقم آپؐ کا ہے
بخششیں منتظر جنبشِ ابرو ہیں حضورؐ
آپؐ مختار ہیں، موجود و عدم آپؐ کا ہے

سرور ارماں/لاہور

نعلین مبارک کو سجا دیجیے سر پہ
آیا ہوں بڑی دور سے میں آپؐ کے در پہ
صدیقؓ ہو کہ عمرؓ ہو، عثمانؓ ہو کہ حیدرؓ
نازاں ہے رفاقت بھی ترے شمس و قمر پہ
پلکوں سے کروں صاف ترا روضۂ اقدس
مامور رہوں میں اسی خدمت کے ہنر پہ
رہتی ہیں ہمیشہ وہاں رحمت کی گھٹائیں
انوار برستے ہیں مدینے کے نگر پہ
ظلمات کے پردوں سے نکالا گیا سورج
آمد ہے حضورؐ آپ کی احسان سحر پہ
اُجڑے ہوئے جنگل کو ہرا ہم نے کیا ہے
لکھ لکھ کے ترا نام ہر اک سوکھے شجر پہ
سلطانوں کے سلطانوں کے سلطانوں کے سلطان
بیٹھے ہیں گدا بن کے حضورؐ آپؐ کے در پہ
ہر بار میں ہو جاؤں جلیلؔ اس کا ہی حصہ
جو کارواں چلتا ہو مدینے کی ڈگر پہ

احمد جلیل/اوکاڑہ

نئے رستے سجھانا اور نئے در باز کرنا
حرا سے لوٹنا اور اک سفر آغاز کرنا
محمد مصطفیٰؐ کو دے کے سالاری ہماری
ہر اک اُمت سے اس اُمت کو تھا ممتاز کرنا
درود پاک پڑھنے کی ہمیں ترغیب دے کر
ہمیں بھی رب کعبہ نے تھا ہم آواز کرنا
ہمیں تخلیق کرنے کی ضرورت تھی اسے بھی
کہ اس نے بھی تو افشا تھا یہ آخر راز کرنا
اسی کی ذات سے رکھنا توقع ہر طرح کی
اسی کے نام سے ہر کام کا آغاز کرنا
یہ کم اعزاز ہے ہیں اُمتی خیرالبشر کے
ہمیں بھی چاہیے اس پہ ہمیشہ ناز کرنا
یتیموں، بے کسوں، بیواؤں، ناداروں کو اکرم
روایت ہی نہیں انہیں نظرانداز کرنا

پروفیسر اکرم ناصر/ساہیوال

اسلم کولسری - ایک تابندہ شاعر کی رُخصتی

عامر بن علی

دس شعری مجموعوں کے خالق شاعر، کہنہ مشق صحافی، خوبصورت مترجم اور بے مثال ادیب۔ اسلم کولسری اب ہم میں نہیں رہے۔ انتہائی دکھ کے ساتھ علمی و ادبی حلقوں میں ان کی طویل علالت کے بعد وفات کی خبر سنی گئی۔ جیسی تابندہ ان کی شاعری تھی ان کی شخصیت بھی ویسی ہی خوبصورت تھی۔ ہم اہل قلم اپنی تحریروں اور شاعری میں جس محبت کا والہانہ اظہار اور پرچار کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ اسی تناسب سے وہ محبت، خلوص اور دیگر اخلاقی خوبیاں ہم اہل حرف کی ذاتی شخصیت کا بھی حصہ ہوں۔ کبھی کبھی مگر ایسے خوبصورت ادیب اور شاعر بھی ادبی منظرنامے پر ظاہر ہوتے ہیں جن کی تحریر بھی لاجواب اور شخصیت بھی باکمال ہوتی ہے۔ جن انسانی خوبیوں کا اظہار اور تقاضا وہ اپنے محبوب اور سماج سے کرتے ہیں، خود بھی ان اخلاقی خوبیوں کا پیکر ہوتے ہیں۔ اپنی ادبی زندگی میں ملنے والے قلم قبیلے کے لوگوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو اسلم کولسری ان مستثنیات میں ایک درخشاں مثال نظر آتے ہیں، جو سراپا محبت تھے۔ سرتاپا محبت میں ڈوبے ہوئے محبتیں بکھیرتے ہوئے۔

یوں تو ان کی پیدائش 1946ء میں اوکاڑہ کے ایک نواحی گاؤں کولسر میں ہوئی تھی۔ مگر ایسے عظیم لوگوں کا سن پیدائش اور وفات کوئی زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہوا کرتا ہے۔ اہم واقعہ اور بنیادی اہمیت ان جیسے درویش صفت فنکاروں کا ہم دنیاداروں کے درمیان میں سے ہوکر گزرنا ہے۔ اسلم کولسری ستر برس اپنی درویشی پر قائم رہتے ہوئے ہم اہل دنیا کو محبت کا سلیقہ اور جینے کا ڈھنگ خوبصورت طریقہ اپنی زندگی کی مثال سے سکھاتے گزر گئے۔ ہماری دنیا کی آلائشوں نے انھیں چھوا تک نہیں۔ سخت محنت، جدوجہد اور مشکلوں میں زندگی گزاری مگر ان کی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ ان کو کوئی غم بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی اُجلی مسکراہٹ اصلی تھی۔ بالکل رسمی اور بناوٹی نہیں تھی۔ وفات سے چند روز قبل لاہور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر تیمارداری کے لیے حاضری دی تو وہ چھڑی لے کر بیٹے عمران اسلم کا کاندھا پکڑ کر، بڑی مشکل سے بستر سے اُٹھ کر بیٹھک تک پہنچے۔ ان کی اُجلی مسکراہٹ اور اس کی زندگی و تازگی پر جسمانی نقاہت کا ذرا بھی اثر نہیں تھا۔ وزن انتہائی کم ہو چکا تھا، شیو بڑھی ہوئی تھی لیکن واللہ چہرے سے نور برستا تھا، جو ان کی عمر بھر کی نیکیوں کا ثمر تھا۔

اسلم کولسری کا ذکر ان کے گاؤں کولسر کے تذکرے کے بغیر ادھورا ہے۔ کولسر نہ صرف ان کے نام کا حصہ تھا بلکہ ان کی شخصیت کا بھی لازمی جزو تھا۔ اوکاڑہ چھاؤنی کی تعمیر و توسیع کی غرض سے یہ گاؤں خالی کروالیا گیا تھا۔ اس ہجرت نے اسلم کولسری کی شخصیت پر بہت گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑے۔ کہتے تھے کہ ہندوستان سے جو لوگ ہجرت کر کے آئے تھے ان کا گاؤں تو وہاں موجود تھا مگر وہ بھارت میں، وہاں جا نہیں سکتے تھے، ہمارے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا کہ ہم جا تو سکتے ہیں مگر گاؤں وہاں نہیں رہا۔ ایک بار اُجڑے ہوئے گاؤں میں پہنچا تو گھروں کے مسمار شدہ آثار میں ہوتا ہوا اپنے پرانے گھر تک پہنچ گیا۔ وہاں ایک، نیم شکستہ کچی دیوار پر میری ماں نے مٹی کی لیپائی کی ہوئی تھی۔ میری مرحومہ والدہ کا لیپائی کرتے ہوئے ہاتھ کا نشان وہاں باقی رہ گیا تھا۔ میں اس ہاتھ کے نشان سے لپٹ کر دیر تک روتا رہا۔ اپنے گاؤں کولسر کے قصے سناتے ہوئے کہا کرتے کہ اس کا نام تو ''محبت پورہ'' ہونا چاہیے تھا۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ میری بہن برقعہ پہنے ہوئے اوکاڑہ کے بازار سے گزر رہی تھی کہ کسی بزرگ نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ اجنبی آواز سن کر ٹھہر گئی۔ بزرگ میرے والد کا نام لے کر اس سے کہنے لگا کہ تم کیا اس کی بیٹی ہو؟ میری بہن نے اثبات میں سر ہلایا جو کہ اس طرح پردے میں تھی کہ صرف آنکھیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ بزرگ کو اس نے پہچان لیا تھا، بچپن میں اپنے گاؤں میں بہن نے اسے دیکھ رکھا تھا، مگر وہ حیران رہ گئی کہ اس نے پہچانا کیسے؟ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے تمہارے والد کی خوشبو ادھر سے آئی تھی، اس لیے تم سے پوچھ لیا۔

اسلم کولسری کا گاؤں جب اُجڑ گیا، تو پھر اس کی ذات میں بسنے لگا تھا، اس کے نام کا حصہ بن کر تو تاریخ میں بھی زندہ رہے گا۔ ایک بے حس سے نظر آنے والے آدمی کا بتاتے ہیں کہ وہ چھوٹے قد کا نیم برہنہ رہنے والا ایسا آدمی تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس پر کسی غم یا خوشی کا اثر نہیں ہوسکتا۔ سارے جسم پر اس کے بال تھے۔ ساری زندگی اس کو کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب گاؤں اُجڑ گیا، تو ایک شام کسی اُجڑے مکان سے رونے کی آواز سنائی دی۔ لوگوں نے جا کر اس مکان میں دیکھا تو وہ بے حس نظر آنے والا رحانامی شخص اپنے گھر میں لگے نیم کے پیڑ سے لپٹ کر زاروقطار رو رہا تھا۔

اسلم کولسری نے ابتدائی زندگی میں مزدوری کی اور ساتھ ساتھ پڑھائی کرتے رہے، یہاں تک کہ ایم اے کر لیا۔ لاہور پہنچ کر صحافت سے منسلک ہو گئے۔ بابا جی اشفاق احمد انھیں اردو سائنس بورڈ لے گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد روزنامہ دنیا جوائن کر لیا۔ ان جیسے بلند پایا اور خوبصورت شاعر ہند، سندھ میں کم کم ہی پیدا ہوئے ہیں۔ مگر منکسر المزاج ایسے کہ خود کو فقط شاعر کہتے ہوئے بھی شرما جاتے۔

ان کی شاعری سے میرا پہلا تعارف کالج فرسٹ ایئر میں اس شعر کے ذریعے ہوا، جو ملک کے دیگر طلباء ہوسٹلز کی طرح ہمارے ہوسٹل میں بھی بے حد مقبول تھا۔

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

طلبا ہوسٹل میں قیام پذیر لڑکوں کے لیے اس شعر کے ساتھ ذاتی نسبت اور اپنائیت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں دوستوں کا کچھ کہنا ہے کہ وہ زندگی کے ویرانے پر اُمڈنے والی گنگھور گھٹا اور اس آہستہ خرام بادل کے مانند ہے جو اپنی دھیمی دھیمی کن من سے دھرتی کو ایک طویل عرصے کے لیے اس کی اندرونی پرتوں تک سیراب کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ یہی سیرابی زندگی کے ویرانے کو چمن میں بدلنے کی معجزانہ اہلیت بھی رکھتی ہے۔ ان کی رحلت سے اداس دل یہ اشعار پڑھ کر اور بھی دکھی ہو جاتا ہے۔

سوچ سوالی کر جاتے ہیں
صبحیں کالی کر جاتے ہیں
اسلم چھوڑ کے جانے والے
آنکھیں خالی کر جاتے ہیں

اسلم کولسری سے مل کر پتا چلتا تھا کہ انسان اتنا نفیس بھی ہو سکتا ہے۔ وہ نہ صرف آدمیت کے معیار پر پورے اُترتے تھے بلکہ ان جیسے لوگوں کو دیکھ کر ہی آدمیت اور انسانیت کا معیار قائم کیا جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

کلیات میر ریحان

میر ریحان

صفحات 304 قیمت: 600 روپے

ناشر: ادبستان

6C دربار مارکیٹ نزد داتا دربار، لاہور

نہ آفتاب نہ ہی ماہتاب دیکھتا ہوں
میں صرف شہر مدینہ کے خواب دیکھتا ہوں

بس آج کل میں بلاوہ وہاں سے آئے گا
گل مراد! تری آب و تاب دیکھتا ہوں

گناہ گار بھی میں اور شرمسار بھی میں
ہر ایک سطر عمل آب آب دیکھتا ہوں

میں آئینے سے نظر بھی ملا نہیں سکتا
کہ اپنا عکس مثال حباب دیکھتا ہوں

بہ پائے سرور عالم ہوں سر جھکائے ہوئے
نہیں ہے دیکھنے کی مجھ میں تاب دیکھتا ہوں

مہک رہا ہے لبوں پر مرے درود پاک
سو حرف نعت کو رشک گلاب دیکھتا ہوں

مری نجات بھی ممکن ہوئی علی یاسر
سو روئے پاک رسالت مآب دیکھتا ہوں

علی یاسر

اُن کے جلوے سرور دیتے ہیں
آدمی کو شعور دیتے ہیں

تیرگی اُن سے دور بھاگے ہے
جن دلوں کو وہ نور دیتے ہیں

دشمن جان سے بھی پیار کرو
یہ سبق بس حضور دیتے ہیں

ان کی ہو جائے گی عنایت خاص
اُمتی کو وہ نور دیتے ہیں

اُن کا ہو آرزو کرم جب بھی
بانجھ شاخوں کو بور دیتے ہیں

خالق آرزو

جدید روہی کے نقش و نگار

ڈاکٹر مختار عزمی

اس میں کوئی شک نہیں کہ لمحہ موجود ہی وہ لمحہ ہے جہاں ماضی اور مستقبل دونوں گلے ملتے ہیں۔ اس وقت جو سلسلہ روز و شب ہم پر حاوی ہے، ایک طرف ماضی کے تمام تر تجربات کا امانت دار ہے تو دوسری طرف اس کی کوکھ سے مستقبل کے نت نئے واقعات جنم لیں گے۔ بقول اقبالؒ:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات

یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ خطہ روہی کا لمحہ موجود ایک معتبر لمحہ ہے، ایک شاندار لمحہ ہے۔ واضح رہے کہ اس مختصر مقالہ میں روہی کا بار بار تذکرہ کرتے ہوئے ہمارا مطالعہ زیادہ تر ضلع رحیم یار خان پر محیط ہے۔ چنانچہ جدید روہی کے نقش و نگار کا جائزہ لیتے ہوئے ضلع رحیم یار خان میں ہونے والی ہمہ جہت ترقی کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس علاقے میں نظر آنے والی ترقی کے خواب دیکھتے دیکھتے نہ جانے ہماری کتنی نسلیں رزقِ خاک ہوگئیں۔ ہماری دعا ہے کہ اس خطے میں ترقی کا جو عمل جاری ہوا ہے وہ اسی طرح جاری و ساری رہے۔ آیئے مختلف شعبوں کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے پہلے سیاسی شعبے کو لیتے ہیں کیونکہ اس کے اثرات باقی تمام شعبوں پر بھی بہت گہرے پڑتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی پاکستان میں جو نیا بلدیاتی نظام متعارف کروایا گیا اس کا تجربہ ضلع رحیم یار خان میں بھی ہوا اور خوب ہوا۔ پہلے ضلع ناظم مخدوم سید احمد محمود ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور پارلیمنٹیرین تھے ان کے ساتھ کیپٹن عطا محمد خان نے بحیثیت ڈی سی او کام کیا۔ سیاستدان اور بیوروکریٹ کا ایک دلچسپ اور نیا کمبی نیشن تھا۔ چودھری پرویز الٰہی کا رحیم یار خان سے صوبائی اسمبلی کا ممبر منتخب ہونا اور بعد ازاں وزیر اعلیٰ بننا بھی ایک اہم واقعہ ہے۔ بلدیاتی اداروں کی دوسری مدت (2005-09)۔ جناب سردار رفیق حیدر خان لغاری ضلع ناظم ہیں۔ جناب اعجاز عامر تحصیل ناظم رحیم یار خان، جناب ڈاکٹر طالوت باجوہ تحصیل ناظم صادق آباد، جناب غلام مرتضیٰ شاہ تحصیل ناظم خان پور اور جناب مخدوم مبین احمد تحصیل ناظم لیاقت پور ہیں۔ جدید روہی کے نقش نگار سنوارنے میں یہ سب رہنما اپنی اپنی جگہ بہت متحرک ہیں۔ ان کی شبانہ روز محنتوں کے ثمرات خواص و عوام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ صحت و صفائی کے معاملات پہلے سے بہت بہتر ہوئے ہیں اور نئے پلان بن رہے ہیں۔ تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن رحیم یار خان کے زیر اہتمام روہی میلہ 2007 گزشتہ 60 برسوں میں ہونے والے تمام ایسے پروگراموں میں سپر ہٹ ہے جس کے لیے تحصیل ناظم میاں اعجاز عامر، تحصیل نائب ناظم شاہنواز کورائی، ٹی ایم او مسعود محمود تمنا اور پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔ یہ مقالہ بھی سیمینار "روہی، تہذیب و ثقافت" کے حوالے ہی سے لکھا گیا ہے۔ اسی طرح کے عوامی میلے تحصیل ناظم صادق آباد جناب ڈاکٹر طالوت باجوہ اور تحصیل ناظم لیاقت پور مخدوم مبین احمد کے زیر سرپرستی بھی منعقد ہونے والے ہیں۔ 07-2006 کے ترقیاتی بجٹ کو 10 ارب روپے تک لے جانے کے دعوے ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ اتنی خطیر رقم سے روہی نمانی کے دکھوں کا کچھ تو مداوا ہوگا اور خوشیوں بھری سویل (صبح) طلوع ہوگی۔ صدر پاکستان، وزیراعظم پاکستان، وزیر اعلیٰ پنجاب، وزیر اعلیٰ سندھ، گورنر پنجاب، ہز ہائی نس شیخ خلیفہ بن زید سلطان النہیان کی تشریف آوری سے یہ علاقہ قومی اور بین الاقوامی طور پر ڈسکس ہونے لگا ہے۔ سیاسی اعتبار سے رحیم یار خان کی خوش قسمتی ہے کہ 3 وفاقی وزراء اور 3 صوبائی وزراء کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ دیگر مشیران کرام اضافی ہیں۔

جہاں تک معاشی شعبے کا تعلق ہے اس میں بھی خطہ روہی بالخصوص ضلع رحیم یار خان بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب گامزن ہے۔ صرف 07-2006 یعنی ایک دو سال کا جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کئی بڑے صنعتی منصوبے شروع کئے گئے ہیں۔ جن میں اتحاد شوگر ملز کا قیام صرف 8 ماہ کی ریکارڈ مدت میں ہوا ہے۔ یونائیٹڈ شوگر ملز نئے مالکان اور نئی انتظامیہ کے ساتھ پہلے سے بہتر حالات میں ہے۔ حلیب ملک پلانٹ، کارپوریٹ فارمنگ، موٹروے کی تعمیر و اجراء اور جیٹھہ بھٹہ تا چوک بہادر پور روڈ کی کشادگی جدید روہی کے حسن کو نکھارنے کا باعث بنے گی۔ بجٹ 07-2006 میں سڑکوں کی مرمت اور

توسیع کے لیے تقریباً 33 کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ گزشتہ کئی برسوں سے خطہ روہی کی پہچان لیور برادرز اب یونی لیور کے نام سے رحیم یار خان کی تعمیر و ترقی میں پہلے سے بڑھ کر سرگرم عمل ہے۔ یونی لیور کی چیئر پرسن بیگم مشرف حئی صاحبہ ہمارے خصوصی شکریے کی مستحق ہیں۔ ایف ایف سی 1، کے بعد ایف ایف سی 2 اور اب فاطمہ فرٹیلائزر جیسا میگا پراجیکٹ شروع ہو چکا ہے۔ جس کا افتتاح وزیر اعظم پاکستان 2006 میں کر چکے ہیں۔ ہز ہائی نس شیخ خلیفہ بن زید کی نوازشات کا دائرہ ضلع رحیم یار خان سے ضلع راجن پور تک پھیل رہا ہے۔ سنتے ہیں کہ دریائے سندھ پر نیا پل بن رہا ہے۔ توقع ہے کہ یہ پل جدید روہی کی مانگ بنے گا بلکہ مانگ کا سیندور ہو گا۔ اس حوالے سے چودھری محمد منیر اعزازی مشیر حکومت ابو ظہبی کا شکریہ ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔ چودھری صاحب بجا طور پر فرزند رحیم یار خان ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں۔ شیخ زید ائیر پورٹ ہو، شیخ زید ہسپتال ہو یا شیخ زید میڈیکل کالج، پیلس ہو یا سکول، سڑکیں ہوں یا پل جگہ جگہ چودھری صاحب کی خدمات کی زندہ نشانیاں موجود ہیں۔ یہ جدید روہی کے وہ نقش و نگار ہیں جن کے پس منظر میں برس ہا برس کی محنت اور کروڑوں روپے کے اخراجات شامل ہیں۔ صرف ایک ائیر پورٹ کی مثال ہی کافی ہو گی۔ شیخ زید ائیر پورٹ پاکستان کی چوتھی بڑی ائیر پورٹ ہے جو مستقبل میں ایک بین الاقوامی حیثیت اختیار کرنے والی ہے۔

تعلیمی شعبے کا جائزہ لیں تو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سب کیمپس کا قیام، شیخ زید میڈیکل کالج کا قیام، خواجہ فرید گورنمنٹ کالج میں پوسٹ گریجوایٹ کلاسز کا اجراء، پنجاب گروپ آف کالجز کی آمد، شیخ خلیفہ یونیورسٹی کا سنگ بنیاد، ورچوئل یونیورسٹی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ذیلی کیمپس کا قیام اہم واقعات ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ شیخ زید میڈیکل کالج کے طلباء و طالبات کا پنجاب بھر میں پہلی دس پوزیشن حاصل کرنا اور خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کے سٹوڈنٹس کا بورڈ اور یونیورسٹی میں ٹاپ پوزیشن حاصل کرنا جدید روہی کے روشن چہرے کی چمک دمک کو ظاہر کرتا ہے۔ بہر حال 40% خواندگی کو 80% میں بدلنے کا خواب ابھی شرمندہ تعبیر ہونا ہے۔ میڈیکل کالج کے علاوہ زرعی کالج اور انجینئرنگ کالج کا قیام وقت کا اہم تقاضا ہے جس کے لیے ٹھوس بنیادیں موجود ہیں۔[۱] موجودہ زرعی کالج اور انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی تھوڑی سی کوشش کے ساتھ پوسٹ گریجوایٹ لیول تک لے جایا جاسکتا ہے لیکن یہ بات شاید ہمارے عوامی نمائندوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ کاش ہمارے تعلیمی اداروں کا اشتراک اور الحاق بیرون ملک کی اہم یونیورسٹیوں سے ہو جائے۔ اگرچہ ضلع کونسل کے بجٹ 07-2006 میں تعلیم کے لیے تقریباً 2 ارب روپے رکھے گئے ہیں۔ مگر ان کا درست استعمال ہی درست نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈی سی او حامد نواز شیخ ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ علمی سرگرمیوں کے علاوہ ادبی سرگرمیوں کی بھی خصوصی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

جہاں تک ٹرانسپورٹ کے شعبے کا تعلق ہے شیخ زید ائیر پورٹ کا قیام جدید روہی کی ترقی میں ایک سنگ میل ثابت ہو رہا ہے۔ یہ ائیر پورٹ سندھ پنجاب اور بلوچستان کے مابین ایک حسین سنگم بنتا جا رہا ہے۔ ریلوے ٹریک کے حوالے سے باتیں زیادہ ہیں مگر کام کی رفتار سست ہے۔ البتہ ڈائیوو کمپنی نے رحیم یار خان سے اپر پنجاب اور صوبہ سرحد کے لیے بین الاقوامی معیار کی روڈ سروس مہیا کر کے سفر کی مشقت قدرے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ سروس کراچی تک بھی کامیابی سے چل پڑی تو ایک نعمت سے کم نہیں ہو گی۔[۲] پرائیویٹ ائیر کنڈیشنڈ کوچز نے بھی سفر کی سہولتیں مہیا کی ہیں لیکن ڈاکوؤں کی آئے دن کی وارداتوں کی وجہ سے پسے ہوئے مسافروں اور لوٹ کھسوٹ پر تیار عملے کے مابین لڑائی جھگڑے روز کا معمول ہیں۔

اگر امن و امان کے شعبہ کا جائزہ لیں تو لوگوں کی شکایات بجا ہیں۔ لاہور کراچی جیسے بڑے شہروں کے مقابلے پر یہاں جرائم کی شرح کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے شہروں اور دوسرے ملکوں کے لوگ یہاں کاروبار کر رہے ہیں۔ مگر مثبت ترقی کو دیکھتے ہوئے اب ڈاکوؤں اور لٹیروں نے بھی اس علاقے کا رخ کر لیا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ جرائم کے اعتبار سے بھی اس علاقے کو بڑے شہروں کے برابر لانے پر تلے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں محافظ اسکواڈ بنا کر پولیس کی طاقت میں اضافہ اور کوئیک ایکشن کا سلسلہ شروع کیا

جاچکا ہے۔ نیز موٹروے پولیس بھی کافی فعال کردار ادا کر رہی ہے۔

شعبہ ابلاغ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن مختلف چینلز اور کیبل کے سلسلے چل نکلے ہیں۔ 2006 میں روزنامہ ایکسپریس کا اجراء ہونے سے خطہ روہی کے مسائل قومی سطح پر اُجاگر ہو رہے ہیں۔ پتن منارہ کے آثار کو محفوظ کرنے کی بات ہو یا خواجہ فرید کی جائے ولادت کو دریا کے کٹاؤ سے بچانے کی بات، تعلیمی معاملے ہوں یا ادبی حوالے، ایکسپریس نے واقعی ایکسپریس ہونے کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ اس امر کے لیے نوجوان جذبوں سے بھرپور ریذیڈنٹ ایڈیٹر سید عارف معین بلے اور ان کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔ آثار قدیمہ اور ہماری تہذیب کے مدفون خزانوں کی تلاش کے لیے خواجہ فرید گورنمنٹ کالج کی پتن منارہ ہسٹاریکل سوسائٹی عرصہ تیس سال سے کوشاں ہے۔ حال ہی میں معروف ماہر اثریات ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر اور بین الاقوامی ماہر آرکا ئیوز، ریسرچ سکالر اور دانشور اور یامقبول جان کے خصوصی لیکچر بھی ہو چکے ہیں۔

جدید روہی کے نقش ونگار اس تیزی سے نمایاں ہو رہے ہیں کہ ایک مختصر مقالے میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ ہم کس شعبے کا ذکر کریں اور کس کا نہ کریں۔ آم کے شیریں ذائقے کا ذکر کریں یا کینو کے خوبصورت رنگ اور میٹھے ترشی ذائقے کا، کھجوروں کی چھلکتے خوشوں کی بات ہو یا تازہ سبزیوں کی، زراعت اور آبپاشی کے لیے صدر مملکت کے خصوصی فنڈز، 30 کروڑ روپے سے بننے والے پختہ کھالوں کا ذکر کریں یا ان میں بہنے والے میٹھے پانی کا جو ہماری فصلوں کی جڑوں کو سیراب کر رہا ہے۔ بقول پروین شاکر

وہ قطرہ قطرہ مجھے پیار کی نشانی دے
کوئی تو ہو جو میری جڑوں کو پانی دے

بجلی اور گیس کی پھیلتی ہوئی لائنوں کا ذکر کریں یا محکمہ صحت کی پولیو ختم کرنے کی منظم مہم کا شیخ زید ہسپتال کی عوامی خدمت کا ذکر کریں یا علامہ اقبال لائبریری میں بہترین سہولتوں کا (تحریک پاکستان کی پکچر گیلری کا افتتاح میاں اعجاز عامر نے کیا ہے)۔ اس گیلری میں رکھی جانیوالے نایاب تصویروں کا ذکر کریں یا سی پی کے تحت نئے منصوبوں کے اجراء کی بات کریں، لکھتے لکھتے قلم تھک گیا ہے مگر میرے رب کی نعمتیں کم نہیں ہوئیں۔ ہم اپنے رب کی کس کس نعمت کا انکار کریں اور کس کس نعمت کا شمار کریں۔

روہی دھرتی ماں میری ہے
میں ہوں اس کا مان
اس کی چادر کا رکھوالا گبھرو شیر جوان
میری رگوں میں خون ہے اس کا جاری ہر ایک آن
روہی میری شان ہے عزمی
جان ہے پاکستان
(۲۰۰۷ء)

حوالہ وحواشی:

۱- الحمدللہ، کتاب کی اشاعت (۲۰۱۵ء) تک رحیم یار خاں میں خواجہ فرید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی قائم ہو چکی ہے۔

۲- ڈائیوو کمپنی نے بھی اپنی سروس رحیم یار خان/ صادق آباد سے کراچی تک بڑھا دی ہے۔

وہ مژدہ تھا ولادت کا کہ اک جھونکا صبا کا تھا
کھلا شاخِ رسالت پر گلِ تازہ ہدایت کا

چمک تھی جس ستارے کی خدا کی سب کتابوں میں
وہ آغوشِ ہو ہاشم میں تارہ نور کا اترا

ملی ہیں دائمی کچھ بھی زمانے کو رسالت سے
وگرنہ یہ زمانہ اک سیہ شب کے سوا کیا تھا

علوم دین ودنیا سب اُسی چشمے سے پھوٹے ہیں
لقب اُمی نبی کا اور بحرِ علم وہ ٹھہرا

قدم بوسی کا حاصل ہے شرف خاکِ مدینہ کو
وجودِ خاک بھی میرا اُسی مٹی میں ضم ہوتا

اسلم سحاب ہاشمی

سخن کے باب تجلی سے مستفید ہوئے
حروفِ نعتِ پیمبر فروغ دید ہوئے

ولائے سیدِ خیر الوریٰ میں دیوانے
درود پڑھتے ہوئے شوق سے شہید ہوئے

دعائے عشق پڑھی صبح دم مدینے میں
گلِ مراد مجھے ہر قدم رسید ہوئے

درِ عطا سے وہ عزت ملی عروج ملا
غلام ہوتے ہوئے وقت کے فرید ہوئے

نبیؐ کی دعوتِ حق کام آ گئی مظہر
قدیم ذہنوں کے انسان سب جدید ہوئے

مظہر بخاری

علی رضا کی ثنائے سرورؐ

ریاض ندیم نیازی

علی رضا سے میرا پہلا تعارف ایک ایسے صاحب طرز نعت خواں کے طور پر ہوا جس کی آواز میں رب کریم نے بڑا ہی سوز و گداز رکھا ہے۔ علی رضا نے جس محفل میں بھی نعت پڑھی حاضرین جھوم اُٹھے اور اُن پر علی کی آواز کا خوشگوار تاثر اُبھرا اور وجد کا سماں بندھتا چلا گیا۔ سامعین محفل اس کی آواز کے زیر و بم، اُتار چڑھاؤ اور والہانہ انداز کے ساتھ نبیؐ رحمت کی تعریف و توصیف کے خزانے اپنی ساعتوں کا نصیب بناتے چلے گئے۔ وہ آج بھی اس بات پر نازاں رہتے ہیں کہ انھوں نے آقائے دو جہاںؐ کی جو توصیف و ثنا سماعت فرمائی وہ علی رضا کی زبان سے ادا ہوئی۔

اور اب ''ثنائے سرورؐ'' کے نام نامی سے خوبصورت نعتیہ مجموعہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس مجموعے کے ذریعے میں ایک اور علی رضا سے متعارف ہو رہا ہوں جو ایک نعت خواں ہی نہیں بلکہ ایک نعت گو شاعر بھی ہے اور شاعر بھی ایسا کہ جس کی نعت نگاری جہان ادب کے نعتیہ باب میں اپنی فکری تخلیق سے یہ ثابت کر رہی ہے کہ شاعر کا فکری وفور جب پیکر نعت میں ڈھل جاتا ہے تو اُلفتِ محمدیؐ اس کا مرکزی خیال ٹھہرتا ہے۔ اگر اس شخص سے میری محبت یہ کہے کہ علی رضا تم تو بنے ہی جہان نعت کے لیے ہو۔ نعت کا فروغ اور ترویج تمہاری اوّلیں و آخریں خواہش ہے اور یہی پاکیزہ خواہش تمہیں میدانِ عمل میں رواں دواں رکھے ہوئے ہے تو غلط نہ ہوگا۔ عہد موجود کے نامور نقاد محترم جناب ریاض مجید صاحب کا یہ کہنا بجا ہے کہ

''علی رضا کی عقیدت نگاری نعت پر مشتمل ہے۔ حضور اکرمؐ کی ذات بابرکات، ان کا پیغام، ان کا شہر مبارک اور اس طرف سفر کا ارادہ، سفر، وہاں کا قیام اور وہاں کے ماحول کا دھیان ہی علی رضا کے ذوق کے لیے ایک دل آویز مبحث ہے۔ علی رضا نے ان تصورات اور ان سے جڑے ہوئے تجربات و مشاہدات سے بڑے خوبصورت نعتیہ اشعار نکالے ہیں۔''

اس رائے کے بعد علی رضا کے یہ نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مجھے ہر قدم ملی آبرو تری نعت سے
میں کہ منزلوں میں ہوں سرخرو تری نعت سے

....

بیاں شانِ رسالتؐ کر رہا ہوں
حقیقت میں عبادت کر رہا ہوں

....

خدائے ارض و سما کا کرم ہے جس نے رضا
نبیؐ کے در پہ مجھے منصب گدائی دیا

مذکورہ بالا تینوں اشعار علی رضا کی عقیدت کے قاران سے پھوٹتی اظہار کی وہ فکری روشنی ہے جو اس دیار میں اس کو ایک صاحب فن عقیدت مند کے طور پر نمایاں کرتی ہے۔ خدائے جل شانہٗ کے کرم پر نازاں علی رضا نبی دو جہاںؐ کے در کی گدائی ملنے پر شاداں ہے۔ اس کا وجدان اس بات پر سرشار ہے کہ وہ نعت کی صورت میں جو شانِ رسالتؐ بیان کر رہا ہے وہ در حقیقت عبادت ہے اور یہی عبادت اُسے دربارِ مصطفویؐ میں غلامی کی سند عطا کرتی اور قدم قدم پر اُس کی عزت و آبرو میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس فکری قلم رو میں درج کچھ اور اشعار دیکھیے:

دل و نگاہ کو طیبہ کے روبرو کر کے
میں نعت کہتا ہوں سوچوں کو باوضو کر کے

....

دیکھتا رہتا ہوں طیبہ کی طرف
اب یہی شوق نظارا ہے مرا

....

پکارے کیوں نہ مدینہ مدینہ دل ہر دم
مرا ضمیر اس خاک سے اُٹھا ہوا ہے

دیارِ طیبہ علی رضا کی محبت و عقیدت کا وہ مرکز تجلی ہے جس کے روبرو اس کی باوضو آرزوئیں، سوچوں کے ایوان میں نعت کے پھول سجاتی چلی جاتی ہیں اور یہی اور اس کی آنکھوں کا ''شوق نظارا'' بن کر جگمگاتا ہے اور زبان پر گلزار مدینہ کی جلوہ سامانی کیف و نشاط کے دل فریب مناظر تخلیق کرتی چلی جاتی ہے۔ میں راجہ رشید محمود کے ان الفاظ کی تائید کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں وہ کہتے ہیں:

''ثنائے سرورؐ'' کے اشعار نعت کا معیار

اور وقار پیش کرتے ہیں۔ زبان صاف ستھری، سیدھی سادھی اور پرکیف ہے۔ اشعار کا فکری، وجدانی اور جمالیاتی انداز بڑا جاندار ہے۔ یہ انداز نعت گوئی اس تعقل و تفکر کی نشاندہی کرتا دکھائی دیتا ہے جو ممدوحؐ کے کرم پر دال ہے۔''

بلاشبہ علی رضا کی نعتیہ شاعری فکر و نظر کا وہ تحفۂ خاص ہے جو اُسے دربارِ رسالت مآبؐ کی طرف گامزن کیے ہوئے ہے اور اس کی ہستی فخر و انبساط کے سمندر میں موجزن رہتے ہوئے اس سفر پر رواں دواں ہے۔ شاعر کا قلبی میلان بابِ نعت کی کشادگی کے لیے ہمہ وقت تیار و مستعد ہے۔ نعت کے تخلیقی وفور نے شاعر کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے اور اس کی فکرِ نعت کی کہکشاؤں میں محوِ پرواز ہے۔ دو شعر دیکھیے:

مقصود موحدو ہے اگر امن و آشتی
نافذ کرو جہاں میں سرکارؐ کا نظام

جہاں وحدت کی ہیں بہاریں
گل معطر نبی رحمتؐ

الغرض علی رضا نعت نگاری کے ذریعے دنیا میں امن و آشتی پھیلانے کے خواب آنکھوں میں سجائے ہوئے پھر رہا ہے تو یہ اس کی خوش بختی ہے۔ کیونکہ ہم سب کا ایمان ہے کہ آقائے نامدار کو ''رحمت اللعالمین'' کا لقب اسی لیے عطا ہوا کہ آپ کی ذاتِ مبارکہ نے وحدتِ ملی، مذہبی رواداری اور معاشرتی اقدار پر مشتمل ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جس کی اساس ہی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا تھا۔ آج کے اس دورِ پرفتن میں ایک بار پھر سیرت النبیؐ کے درخشاں نقوش کی رحمت ہی ہمارے شاعر کی دلی تمنا ہے اور یہ تمنا جس انسان کے دل میں ہو وہ کبھی بھی ناکام نہیں ہوسکتا۔ علی رضا کے ان اشعار کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔

کیا بے تاب جب ہجرِ نبیؐ نے
تو آیا میرے ہونٹوں پہ مدینہ

....

آقائے دو عالمؐ کی غلامی مجھے بخشی
مجھ ایسے گنہ گار پہ اللہ کا کرم ہے

....

اک ان کی ذات سہارا ہے بے سہاروں کا
وگرنہ کون ہمارا ہے، غم کے ماروں کا

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	140/- روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	350/- روپے
چاڑے کی چاندنی	غلام عباس	200/- روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	200/- روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	700/- روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	150/- روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	700/- روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	800/- روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	200/- روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	400/- روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	300/- روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	500/- روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	250/- روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	500/- روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	250/- روپے
ولی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	250/- روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	400/- روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	200/- روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع کی تحقیقی اور تنقیدی جہات

اللہ یار ثاقب

پروفیسر افتخار شفیع کا شمار ہمارے زمانے میں نئی نسل کی ان ادبی شخصیات میں ہوتا ہے، جو ایک ممتاز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نئی سمتوں کا سراغ لانے والے نقاد بھی ہیں۔ان کی علمی، ادبی سرگرمیوں اور اشغال نے ایک معتبر تنوع کے متوازن صورت اختیار کرلی ہے۔انھوں نے مختصر عرصے میں اپنے تخلیقی اظہار کے ساتھ نثر نگاری میں بھی معتبر نام پیدا کیا ہے۔ان کے شعری اور نثری اظہار کا سلسلہ تا حنوز جاری ہے۔افتخار شفیع آج کل ملک کی معروف تعلیمی درس گاہ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں شعبہ اردو سے وابستہ ہیں اور تا حال یہیں علمی و ادبی چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔(۱)

ان کی نثر قدیم و جدید کا سنگم ہے۔''مطالعہ انسان اور فن خاکہ نگاری''(۲) کا ہیولہ وہ یونان کی سرزمین سے لیتے ہیں اور آج کے جدید دور تک کے حوالے اس میں موجود ہیں۔اسی طرح ''مولانا عظامی ہوشیار پوری''(۳) ایسا مضمون ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ افتخار شفیع جہاں اردو کے قدیم ادب سے نسبت رکھتے ہیں وہاں فارسی زبان سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔ان کا ایک طویل مضمون ''ارمغان حجاز فارسی۔چند نئے مباحث''(۴) بھی ان کی فارسی شناسی کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے۔

افتخار شفیع کی ادبی و علمی معرکہ آرائی ان مجموعوں کی صورت میں منظر عام پر آچکی ہے:

۱۔ پاکستانی ادب کا منظر نامہ، مرتبہ، تدوین (۲۰۰۶ء)
۲۔ آثار جنوں تحقیق و تدوین (۲۰۰۸ء)
۳۔ ڈاکٹر اسلم انصاری (شخصیت و فن) تحقیق و تنقید (۲۰۱۰ء)
۴۔ شہر غزل کے بعد (خاص نمبر صوت ہادی) تحقیق تدوین (۲۰۱۰ء)
۵۔ اصناف شاعری تحقیق و تنقید (۲۰۱۱ء)
۶۔ اردو ادب اور آزادی فلسطین تحقیق و تنقید (۲۰۱۱ء)
۷۔ اصناف نثر تحقیق و تنقید (۲۰۱۲ء)
۸۔ حفیظ الرحمن خان (فن و شخصیت) مرتبہ، تدوین (۲۰۱۳ء)
۹۔ کلیات نثر مجید امجد مرتبہ، تدوین (۲۰۱۶ء)

''پاکستانی ادب کا منظر نامہ'' حفیظ الرحمن کے مضامین کا مجموعہ ہے، جس کو افتخار شفیع نے اپنے سیر حاصل مضمون کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

یہ افتخار شفیع کا تنقید و تحقیق کے ضمن میں پہلا قدم ہے۔کسی کتاب کی تدوین و ترتیب اور اُس پر تنقید و تحقیق کے مراحل سے گزرنا ایک صاحب کمال شخصیت کے فنی و تکنیکی امور کی آگاہی کا غماز ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ''پاکستانی ادب کا منظر نامہ'' میں افتخار شفیع نے حفیظ الرحمن کے مضامین کی ترتیب میں علمی و ادبی اور فنی مہارت سے کام لیا ہے اور اس پر مستزاد ان کا مقدمہ ''تقدیم'' ہے۔وہ ایک مصنف کی قدر و قیمت کا تعین محقق، نقاد اور قاری کے رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک مصنف اس وقت قابل قدر ہوتا ہے جب وہ کنواری زمین پر کاشت کرتا ہے اور جب وہ وجدانی طور پر ایسے علاقے کا انکشاف کرتا ہے، جس میں منطق اور شماریات کا عمل دخل مشکل سے ہو۔ان حالات میں یہ جاننا کہ مصنف ٹھیک کہہ رہا ہے اور اس نے سچائی کی بنیادی اُمنگوں کو اساس میں منسلک کیا ہے کوئی آسان کام نہیں۔شاید یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نقاد اور قاری کی آرا میں تصادم ہوتا ہے۔نقاد تخلیق کار پر اپنے اپنے برانڈ کا لیبل لگا کر خود کو نمایاں کرتا ہے جبکہ عوام کی رائے مختلف ہوتی ہے۔''(۵)

افتخار شفیع کے بارے میں ڈاکٹر وحید عشرت لکھتے ہیں:

''وہ مستقبل میں ایک اچھے نقاد بن کر سامنے آئیں گے۔اُنہوں نے نہایت اختصار کے ساتھ بعض جدید موضوعات کو اپنے پیش لفظ میں متعارف کرایا ہے، جس سے ان کی ادبی معاملات پر گہری نظر کی عکاسی ہوتی ہے پاکستانی ادب کو ایسے طاقتور نقاد مل گئے تو پاکستانی ادب کی شناخت و پرداخت کا معاملہ سلجھنا کچھ دور کی بات نہیں۔اس سے نہ صرف ہم اپنی جڑوں کا کھوج لگا سکیں گے بلکہ اپنی شناخت اور تشخص کی بھی حفاظت کر سکیں گے۔''(۶)

تحریک پاکستان کے رہنما سردار عبدالرب نشتر کے استاد شیخ عطا اللہ جنوں فارسی (۱۸۹۳ء۔۱۹۶۱ء) فارسی و اردو شاعری میں نمایاں مقام رکھتے تھے مگر گردش ایام نے ان کے سرمایہ

شاعری کو گم گشتہ بنا دیا۔ ۱۹۶۱ء میں شیخ جنوں کا انتقال ہوا اس کے چار سال بعد ضلعی انتظامیہ نے ان کی شاعری کو تلاش کرنے کے لیے پوری تگ و دو کی فارسی کی چند غزلیں تو ملیں مگر ان کے اردو کلام کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ جو کام جنوں کی وفات کے چار سال بعد حکومتی مشینری انجام نہ دے سکی وہ نصف صدی کے بعد تن تنہا افتخار شفیع نے سرانجام دیا۔ "آثار جنوں" میں شیخ عطاءاللہ جنوں کا تفصیلی سوانحی خاکہ اور ان کے فارسی و اردو کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ افتخار شفیع نے جس کاوش کو کئی سے جنوں پر تحقیق کرنے کے بعد اس کی تدوین و ترتیب کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ "آثار جنوں" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

"میں پروفیسر محمد افتخار شفیع کی ان مساعی پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں جو انہوں نے ایک باکمال ذولسانی شاعر کے کلام کو محفوظ کرنے اور اس شخصیت کو طاق نسیاں سے اتار کر اہل ذوق سے متعارف کرانے میں انجام دی ہیں۔" (۷)

ڈاکٹر اسلم انصاری نہ صرف اردو زبان پر دسترس رکھتے ہیں بلکہ فارسی اور انگریزی زبان پر ان کو عبور حاصل ہے۔ اسلم انصاری ایک خوبصورت شاعر، دقیق محقق اور اعلیٰ اقبال شناس شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت خود میں ایک دبستان ادب ہے۔ ان کی ادبی خدمات پر مشاہیر اردو ادب نے اُن کو خوب سراہا ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی "اسلم انصاری اپنے عہد کی صداقتوں کے شاعر ہے۔" (۸)

ایک قد آور شخصیت کو پرکھنا اس کے کام کی نوعیت اور اس کے فن پر بحث کرنا آسان نہیں۔ اسلم انصاری کے متعلق محمد افتخار شفیع نے اس کام کو خوب نبھایا ہے۔ کتاب کی تقسیم میں ہر موضوع پر الگ الگ بحث کی گئی ہے۔ "ڈاکٹر اسلم انصاری کا خاندانی پس منظر" جس میں روایتی انداز سے بغاوت کرتے ہوئے افتخار شفیع نے افسانوی انداز اپنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بہار رخصت ہو چکی تھی، آم کے درختوں پر کوئل کی نغمہ سرائی کا موسم آنے والا تھا۔ پیرانہ سالی کے دکھوں کی ماری فصیل شہر خود کو پھر سے موسموں کی شدتوں کو سہنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ بہاالدین زکریّا کے روضے کی جالیوں سے باہر جھانکنے والی کرنوں سے سورج بار بار آ کر منہ دھوتا تھا۔ اسی دوران ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ء کے ایک خوشگوار دن، بیرون پاک گیٹ (ملتان) کے ایک پرانی طرز کے مکان میں حاجی قاسم علی کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا۔ نومولود کا نام محمد اسلم رکھا گیا، یہی محمد اسلم بعد میں ڈاکٹر اسلم انصاری کے نام سے علمی اور ادبی حلقوں میں معروف ہوا۔" (۹)

دوسرے باب میں اسلم انصاری کے سوانحی خاکہ کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ جس میں نام، والد، والدہ کا نام، تعلیم، کتب، ملازمت، اعزازات اور مقالہ جات وغیرہ شامل ہیں۔ تیسرے باب میں "ڈاکٹر اسلم انصاری کی کتابیں۔ ایک تعارف" ہے جس میں اسلم انصاری کی کتابوں کا سیر حاصل تعارف پیش کیا گیا ہے۔ "خواب و آگہی" اسلم انصاری کا شعری مجموعہ ہے جس پر افتخار شفیع تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"خواب و آگہی اونچے اونچے بالاخانوں پر مشتمل ایک ایسا شہر ہے جس کے اردگرد کی فصیل بھی دفاعی لحاظ سے بہت مضبوط ہے۔ اس 'شہر غزل و نظم' میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں لیکن وہاں سے پلٹنا شاید ناممکن ہے۔ یہ لفظوں کا ایک ایسا طلسم ہوش ربا ہے جس میں 'صدیوں کا سفر' کرنے کے بعد بھی قاری وہیں آ کے رکتا ہے جہاں سے اس نے سفر کیا تھا۔" (۱۰)

دوسری کتاب "اقبال عہد آفریں" ہے۔ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے افتخار شفیع نے اسلم انصاری کی علمیت اور فکریت کے اُن پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جو اسلم انصاری کے اقبال پر مضامین رقم کیے گئے ہیں۔

مختصراً افتخار شفیع نے اسلم انصاری کی کتابوں "نقش عہد وصال کا" (شعری مجموعہ)، "فیضان اقبال" (منظوم اقبالیات)، "چراغ لالہ" (فارسی مثنوی)، "Lotus and The Sandwaves" (Poem & Plays) "ای بشرای ستارہ غم ناک" (فارسی مثنوی)، "شعر و فکر اقبال" (اقبالیات)، "تکلمات" (ادبی فکری اور تہذیبی کالم)، "نگار خاطر" (فارسی مثنوی)، "ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت" (تحقیق و تنقید)، "چودھری افضل حق اور ان کی تصنیف زندگی" (تحقیق و تنقید) اور "اردو شاعری میں المیہ تصورات" (تحقیق و تنقید) شامل ہیں کا تعارف مفصل انداز میں کرایا ہے۔

اگلا باب "ڈاکٹر اسلم انصاری کی غزل"

ہے جس میں افتخار شفیع نے اسلم انصاری کی غزل پر مدبرانہ بحث کی ہے۔ جس میں اسلم انصاری کے موضوعات، اسلوب، جذباتی میلانات، داخلیت و خارجیت اور فکری سوچوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ وہ اسلم انصاری کی غزل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اسلم انصاری نے غزل میں ایک ایسا لہجہ متعارف کرایا ہے جو بڑے لامحسوس طریقے سے معاشرے میں پھیلے سیاسی، معاشرتی اور معاشی جبر کو بے نقاب کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے دیگر غزل گو شعرا کے برخلاف اس موضوع کو غزل کے پیش کردہ علامتی اور ماورائی انداز میں تخلیق کا جزو بنایا ہے۔" (۱۱)

اگلے دو ابواب میں ڈاکٹر اسلم انصاری کی نظم اور رباعی کی بات کی گئی ہے۔ نظم کے معاملے میں افتخار شفیع نے ایک طرف تو اسلم انصاری کو میراجی، ن۔م۔راشد، مجید امجد اور اختر الایمان کے قبیل کا باشندہ گردانا ہے تو دوسری طرف ان کا ناطہ بیدل اور اقبال کی فکری سوچوں سے جوڑا ہے۔ وہ صرف زبانی جمع تفریق کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اس بات کو مثالوں سے واضح بھی کرتے ہیں۔ رباعی میں بھی اسلم انصاری نے نیا تجربہ کیا ہے جسے افتخار شفیع نے "رباعیات معریٰ" کا نام دیا ہے۔ یعنی اسلم انصاری نے قافیے کی قید سے آزاد رباعی بھی لکھی ہے۔

اگلے ابواب میں ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی شاعری، انگریزی شاعری، تنقیدی شعور، اقبال شناسی، ادبی کالم نگاری اور اسلم انصاری کو ناقدین کی آرا میں دیکھا ہے۔ اسلم انصاری کی فارسی شاعری کے حوالے سے افتخار شفیع لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اسلم انصاری کی فارسی شاعری میں آسمانی مذاہب کی معروف تلمیحات و تواریخ کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ جبکہ انگریزی شاعری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"ڈاکٹر اسلم انصاری کی انگریزی نظموں کا اسلوب (ان کے اپنے محاوراتی اجتہاد کے علاوہ) روایتی انگریزی نظم کا پرتو ہے لیکن ان کے موضوعات زیادہ تر مشرقی علوم اور ان سے منسلک مشاہیر کے افکار و تصورات کا آئینہ ہیں۔ 'مشرق' ان کے لیے خاص روحانیت سے معمور زندگی کا استعارہ ہے۔ اور علوم مشرق ایسے سورج کی مانند ہیں جو 'مشرق' سے طلوع ہوتا ہے۔ اور دعوت نظارہ دیتا ہے۔" (۱۲)

تنقیدی شعور کے متعلق افتخار شفیع لکھتے ہیں کہ اسلم انصاری کی تنقیدی بصیرت میں تحقیقی رجحان کی موجودگی کو تنقید کے مشکل جزیروں کی تلاش کا نام دیا ہے۔ اس حوالے سے افتخار شفیع اسلم انصاری کے مختلف مضامین زیر بحث لائے ہیں۔ اہم ترین مضامین میں "ادبیات عالم میں سیر افلاک کی روایت"، "ابن رشد اور اس کے افکار" اور ان کا تحقیقی مقالہ "اردو شاعری میں المیہ تصورات" اسلم انصاری کے تنقید و تحقیقی شعور کے غماز ہیں۔ افتخار شفیع اسلم انصاری کے فن اور اقبال شناسی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"ڈاکٹر اسلم انصاری نے بطور شاعر، نقاد اور ماہر اقبالیات اپنے مزاج کی جمالیاتی کیفیت تخلیقی پس منظر، عالمانہ نقطۂ نظر کی بنیاد پر خود کو علمی، ادبی اور تہذیبی دنیا میں بھرپور انداز سے متعارف کروایا ہے۔" (۱۳)

اردو ادب میں غالب اور اقبال اس قدر غالب آگئے کہ ان کے لیے الگ الگ مکتب فکر بن گئے ہیں۔ یہاں تک کے اقبالیات کے حوالے سے یہ بات بھی سامنے آرہی ہے کہ اس کے مزید ذیلی شعبوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ افتخار شفیع نے اسلم انصاری کے ان افکاری کشور کشائی کرنے کی کوشش کی ہے جو انھوں نے فکرِ اقبال کے حوالے سے زینت قرطاس کیے ہیں۔ "اقبال عہد آفریں" اور "شعر و فکر اقبال" اسلم انصاری کے اقبال کے متعلق خیالات و افکار کا پرتو ہیں۔

"مظہر غزل" ساہیوال کی ادبی تاریخ میں ایک کلیدی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے جو محسن ساہیوال جناب مجید امجد کی شبانہ روز محنت سے ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں ساہیوال کے اُس وقت تک کے قدیم و جدید شعرا کے کلام کا انتخاب کیا گیا تھا۔ انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ مختصر ترین تعارف اور شعرا کی تصاویر بھی تھیں۔ اُس دور میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔

نصف صدی گزرنے کے بعد "ادارہ صوت ہادی" نے حضرت مجید امجد کی اس روایت کو زندہ کیا اور "مظہر غزل کے بعد" کے نام سے ساہیوال کے شعرا کے کلام کا انتخاب کیا۔ اس تحقیقی کام میں محمد افتخار شفیع اور سید سید علی گیلانی نے خوب محنت اور دیانتداری سے "صوت ہادی" کے اس نمبر کو تاریخی و دستاویزی مقام دے دیا۔ "مظہر غزل کے بعد" میں ہر شاعر کا تفصیلی تعارف بھی دیا ہے۔ "مظہر غزل کے

بعد" ادارہ "صوتِ ہادی ساہیوال" کے ادبی ذوق کا منہ بولتا ثبوت ہے۔" یہ مجموعہ قدیم و جدید رنگ سے مرصع، توانا شاعری کا مرقع اور ساہیوال کے شاعرانہ مزاج ور جحانات کا عکاس ہے۔" (۱۴)

افتخار شفیع کا لکھا دیباچہ "ادب کی موت کا اعلان کب ہوگا؟" کے عنوان سے ہے۔ جس میں اپنی کارگزاری کے متعلق تفصیل بتاتے ہیں اور ادب میں پائے جانے والے رنجشوں اور عداوتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کی نفی کرتے ہیں اور رواداری کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"ہم ادب میں ادعائیت، جانب داری اور گروہ بندی کو 'سرطان' کی طرح مضر گردانتے ہیں، ادب میں رواداری کے قائل ہیں۔ اس میں نہ تو کوئی حرف آخر ہوتا ہے اور نہ مطلقیت، بل کہ مختلف آراء ادب کو زیادہ پروقار اور وسعت پذیر بنا دیتی ہیں۔" (۱۵)

"شہر غزل کے بعد" کے بارے میں ایک معروف ادبی نام ڈاکٹر محمد امین رقم کرتے ہیں:

"محمد افتخار شفیع جو ذہین نوجوان شاعر، نقاد اور محقق ہیں، نے اس مجموعے کو ترتیب دیا ہے۔۔۔۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ تنقیدی بصیرت اور تحقیقی ریاضت کے حامل ہیں۔ یہ مجموعہ ان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس میں ایک سو ساٹھ شعرا کا کلام شامل ہے۔ چھ مضامین اس کے علاوہ ہیں۔ اتنے شعراء کا کلام جمع کرنا اور ان کا انتخاب کرنا بہت محنت کا کام ہے اور پھر ہر شاعر کا مختصر تعارف لکھنا۔ یہ مختصر تعارف اختصار کے ساتھ جامعیت رکھتا ہے۔ جس میں شاعر کی شخصیت اور فن کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ اس کے شخصی و فنی محاسن سمٹ آئے ہیں۔" (۱۶)

"شہر غزل کے بعد" کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ "رفتگانِ شہر" کے تحت اُن شعرا کو رکھا گیا ہے جو اپنی زندگی کا سفر پورا کر چکے ہیں۔ "شعلہ ہائے مستعجل" میں بھی وفات شدگان کا ذکر ہے مگر یہ اپنی نوجوانی کی عمر میں ہم سے بچھڑ گئے۔ "ہنگامہ شہر" وہ حضرات ہیں جو اس دور کے نمائندہ شاعر ہیں جبکہ "سایہ ابر" وہ شعرا ہیں جو اپنے مختصر قیام کے بعد ساہیوال کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ گئے۔

کتاب کے آخر میں مضامین "ایک یادگار مشاعرہ" از حمید اختر، "دبستان ساہیوال کے یادگار لمحات" از سید علی ثانی، "شہر غزل کا مرتب کون؟" از ندیم عباس اشرف، "ساہیوال میں اردو شاعری کے نمایاں رجحانات" از محمد افتخار شفیع اور "ساہیوال میں فارسی شاعری کے گمشدہ نقوش" از محمد افتخار شفیع شامل ہیں۔ ان مضامین سے ساہیوال کی ادبی تاریخ کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں جو اردو ادب میں اپنی تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر افتخار شفیع نے ادب کے طالب علموں کے لیے "اصناف شاعری" تالیف کر کے آسانی پیدا کر دی ہے۔ جملہ "اصناف شاعری" کو تحقیقی حوالوں سے یکجا کرنا ایک بہت کٹھن کام ہے۔ یوں سمجھ لیں افتخار شفیع نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ افتخار شفیع نے کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں اصناف شاعری کو بہ لحاظ موضوع، باب دوم میں بہ لحاظ ہیئت، باب سوم میں غیر ملکی اصناف جبکہ باب چہارم میں متعلقات شاعری پر بحث کی ہے۔

بہ لحاظ موضوع جن اصناف کو رکھا گیا ہے اُن میں حمد، مناجات، نعت، معراج نامہ، منقبت، غزل، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب، واسوخت، ریختی، دوہا، پیروڈی، اردو ماہیا، گیت سہرا، آزاد غزل اور کافی شامل ہیں۔ حمد، مناجات، نعت، معراج نامہ اور منقبت کا تعلق مذہب سے ہے۔ افتخار شفیع نے تحقیقی، فنی اور ہیئتی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے درمیان حد فاصل قائم کی ہے۔ ہر ایک کی جدا جدا تعریف کی ہے۔ ماہرین ادب کی آرا مد نظر رکھتے ہوئے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ ان کی ابتدا، ارتقا، اور اردو میں ان کی روایت کو مختصراً مگر جامع انداز میں بیان کیا ہے۔

غزل اردو شاعری میں اہم مقام رکھتی ہے۔ تقریباً ہر شاعر نے اپنی شعری تسکین کی شروعات غزل سے کی ہیں۔ یہ اور بات ہے جب اُڑنا سیکھ لیا تو غزل کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر لیا۔ غزل کے حامی بھی رہے اور اس کے خلاف بادِ مخالف بھی چلی۔ بقول رشید احمد صدیقی "غزل اردو شاعری کی آبرو ہے لیکن اسے بے آبرو کرنے کی کوشش بارہا ہو چکی ہے۔" جبکہ کلیم الدین احمد کی نظر میں یہ "نیم وحشی صنفِ سخن" ہے۔ الغرض کچھ بھی ہو جب تک دنیا میں شاعری باقی ہے غزل کا نام زندہ ہے۔

غزل کے بارے میں افتخار شفیع نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ غزل کی ہیئت، اس کی بحر، قافیہ اور ردیف کی حدود و قیود کو بیان کیا ہے۔ غزل کے موضوعات "صنف نازک" کے متعلق تھے مگر اب

اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس کے بارے میں افتخار شفیع رقم طراز ہیں:

''آج کی اردو غزل میں وصفِ عشق اور عورتوں سے اظہار محبت کے علاوہ مذہبی، فلسفیانہ، حکیمانہ، سائنسی، اخلاقی اور تہذیبی موضوعات بھی زیر بحث آتے ہیں۔''(۱۷)

اس باب میں دیگر جن اصناف کا ذکر کیا ہے ان میں قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب، واسوخت، ریختی، دوہا، پیروڈی، اردو ماہیا، گیت، سہرا، آزاد غزل، اور کافی شامل ہیں۔جن کو افتخار شفیع نے محنت شاقہ کا ثبوت دیتے ہوئے کلاسیکی مواد سے عرق کشید کر کے منظر عام پر لایا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب بہ لحاظ ہیئت ہے۔جس میں اصناف شاعری کی ہیئتی اصناف پر بحث کی گئی ہے۔مثنوی کا ماخذ، اس کی اقسام اور اردو کی اہم مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ بعدازاں رباعی کے بارے میں افتخار شفیع اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رباعی ایک حکیمانہ قسم کی صنف سخن ہے۔یہ ہیرت کے لحاظ سے مختصر نظم ہے اور صورت کے اعتبار سے مختصر غزل۔اپنی جامع حیثیت کی وجہ سے اسے ادب کی ایک مسحور کن صنف سمجھا جاتا ہے۔یہ شاعری تو ہے ہی لیکن زحافات و تغیرات کی کثرت اسے نثر کے قریب کر دیتی ہے۔رباعی شاید وہ واحد صنف ہے۔جس میں نثر اور نظم، دونوں کے خوب صورت پہلو سمٹ آئے ہیں۔ساخت کے اعتبار سے محدود سے الفاظ کی اس عمارت میں ایک جہان رنگ و بو آباد ہوتا ہے۔''(۱۸)

رباعی کیسے وجود میں آئی اس کے پس منظر میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے:

''اس (رباعی) کی تخریج کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شاعر نے غزنی شہر کے مضافات میں گھومتے ہوئے یعقوب بن لیث صفاری کے لڑکے کو اخروٹ کھیلتے دیکھا۔ ایک اخروٹ لڑھکتے ہوئے سوراخ میں گرنے لگا تو لڑکے نے کہا: غلطاں غلطاں ہمی رود تا سر گو شاعر نے اس مصرعے یا جملے کو موزوں پا کر اس پر تین اور مصرعے لگا دیے، یوں رباعی نے صورت پائی۔''(۱۹)

رباعی کے بعد قطعہ، ترجیع بند اور ترکیب بند پر بحث کی گئی ہے۔وضاحت کے لیے ہر ایک کو مثالوں سے بیان کیا ہے۔مستزاد اگر چہ شاعری میں استعمال ہے مگر بہت کم شعرانے اس ہیئت کو اپنایا ہے۔مستزاد عارض و مستزاد التزام ہر دو کی وضاحت مثالوں سے کی ہے۔اسی طرح مسمط کو بیان کرتے ہوئے تفصیلاً اس کی اقسام کو مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع اور معشر ہر ایک کو بیان کیا ہے۔

انسان فطری طور پر آزاد پیدا ہوتا ہے مگر پھر معاشرہ، سماج، اور رسم و رواج کی قید میں میں چلا جاتا ہے۔ جب ایک معاشرہ دوسرے معاشرے پر مسلط و قابض ہو جاتا ہے تو مقبوضہ معاشرے کی زندگی کی ڈور قابضین کے ہاتھ میں ہوتی ہے، وہ جیسے چاہے اسے استعمال کرے۔''اُردو ادب اور آزادی فلسطین'' ۳۸۴ صفحات پر مشتمل کتاب ہے جو ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آئی۔اس کا پہلا باب ''تحریک آزادی فلسطین ۔تاریخی تناظر'' جس میں مصنف نے آزادی کی تعریف میں عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے کئی ماہرین سماجیات اور ماہرین بشریات کے حوالے دیے ہیں۔

بعد ازاں فلسطین کی تاریخ پر بڑا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔فلسطین کا محل وقوع بیان کرتے ہوئے لفظ ''فلسطین'' اور ''ارض فلسطین'' سے متعلق کئی راویوں کو یکجا کیا ہے۔فلسطین مسلمانوں کے نزدیک معتبر جگہ ہے۔ارض فلسطین میں اللہ تعالیٰ کے کئی انبیا دفن ہیں۔اس باب میں مصنف نے فلسطین کی تاریخ کو عہد بہ عہد مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے۔قبل از اسلام، اسلامی ادوار، عثمانیہ اصلاحات اور اس کے بعد موجودہ حالات تک کو بیان کیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا باب ''تحریک آزادی فلسطین اور اردو نثر'' ہے۔جس میں اردو نثری ادب سے فلسطین کے حوالے سے جو ادب تخلیق ہوا ہے اس کی تحقیق کرتے ہوئے اسے زیر بحث لایا ہے۔افسانے میں انتظار حسین کا ''کانا دجال'' اور ''شرم الحرم''، قرۃ العین کا ''یہ تیرے پر اسرار بندے''، مظہر الاسلام کا ''زمین کا اغوا'' ''سبح آ ہونہ کا'' ''تلی کا جنم''، خالد سہیل کا ''تین سپاہی''، انور خواجہ کا ''الفتح'' جمیل احمد عدیل کا ''اے یروشلم کی بیٹیو''، مصطفیٰ شاہد کا ''خون'' اور علی یار خان کا ''مجاہد'' شامل ہیں جن میں آزادیٔ فلسطین کو موضوع بنایا گیا۔ مصنف نے افسانوں کا فکری، فنی اور موضوعاتی تجزیہ کیا ہے۔سفر نامے میں فلسطین اور آزادی فلسطین سے متعلق مصنف

نے جن سفرناموں کا تجزیہ کیا ہے ان میں بیگم محمود عثمان حیدر

کا ''مشاہدات بلادِ اسلامیہ''، قاضی عبدالصمد صارم کا ''سفرنامہ صارم''، فیض احمد فیض کا ''ظہر محسن کا ماتم اور یاسر عرفات کی سالگرہ''، قدرت اللہ شہاب کا ''اے بنی اسرائیل''، مستنصر حسین تارڑ کا ''خانہ بدوش''، خالد سہیل کا ''زمین کی دیوی''، مظہر اقبال کا ''بیت المقدس کی جانب'' اور مولانا وحید الدین کا ''سفرنامہ فلسطین'' شامل ہیں۔ اس طرح ''اردو ڈراما اور تحریک آزادیٔ فلسطین'' کے عنوان سے افتخار شفیع نے ان ڈراموں کا تحقیقاتی اور تجزیاتی مطالعہ کیا ہے جن میں فلسطین کی آزادی کے عناصر موجود ہیں۔ ان ڈراموں میں مرزا ادیب کا ''فاطمہ برناوی'' اور جاوید دانش کا ''نئی شاخِ زیتون کی'' شامل ہیں۔

کتاب کا تیسرا باب اردو شاعری اور تحریک آزادیٔ فلسطین'' ہے جس میں مصنف نے فلسطین کی آزادی کو اردو شاعری کے تناظر میں دیکھا ہے۔ مصنف نے اردو کے معتبر شعرا کے کلام سے، جن میں علامہ اقبال، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، رئیس امروہوی، نعیم صدیقی، ن م راشد، ابن انشا، حبیب جالب، ظہیر کشمیری، عادل منصوری، احمد فراز اور ضمیر جعفری وغیرہ شامل ہیں، ایسے عناصر کی نشان دہی کی ہے جو براہِ راست فلسطین اور اس کی آزادی سے وابستہ ہیں۔

''تحریک آزادیٔ فلسطین اور نثری تراجم'' چوتھا باب ہے، جس میں ان نثری تراجم کا ذکر ہے جن میں فلسطین کی آزادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انتظار حسین نے ''سعید کی پراسرار زندگی'' انگریزی ناول ''The Secret Life of Saeed'' کا ترجمہ ہے جس کی اصل عربی ہے۔ اس ''ناول میں اسرائیلی ریاست کی منظم دہشت گردی کی داستان خوں چکاں یوں بیان ہوتی ہے جیسے عشق و محبت کا کوئی دل پزیر قصہ ہو۔''(۴۰) افتخار شفیع نے محمد شاہد حمید کے ترجمہ کردہ ناول ''دھوپ میں لوگ'' کو بھی فلسطین کی آزادی کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اسی طرح انھوں نے آصف فرخی، امجد طفیل، مسعود اشعر، کشور ناہید، شجاعت علی، خورشید قائم خوانی اور دیگر اہم مترجمین کے تراجم سے آزادیٔ فلسطین کے آثار تلاش کیے ہیں۔ ان کا دائرہ کار صرف ناول اور افسانہ تک محدود نہیں بلکہ سفرنامہ، آپ بیتی اور رپوتاژ کو بھی شامل مطالعہ کیا ہے۔

باب پنجم ''تحریک آزادیٔ فلسطین اور شعری تراجم'' ہے۔ بہ قول افتخار شفیع عربی منظوم کلام دنیا کے تمام کلام کے برابر ہے۔ دیگر زبانوں کی طرح عربی شاعری میں بھی رومانیت، رمزیت اور جدیدیت کے اثرات مرتب ہوئے۔ شاعری ایسے طبقے سے تعلق رکھتی ہے جس میں احساسیت کا جذبہ دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے دکھ درد کو زیادہ قریب سے سمجھتے ہیں اور اپنے احساس و جذبات کو اظہار کی صورت دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسئلہ فلسطین ہر دل رکھنے والی قوم میں اثر کیے ہوئے ہے اور وہ اپنی اپنی زبان میں اظہار کرتے ہیں۔ اردو شعرا نے دیگر زبانوں سے تراجم کر کے اردو میں ڈھالے ہیں۔ ان میں امجد اسلام امجد، ڈاکٹر شیخ حیدر علی، ڈاکٹر اسرار شید، محمود درویش، سمیح القاسم اور حنا ابو حنا قابل ذکر ہیں۔

فی زمانہ مسلمانوں کو ہر جگہ ہراساں کیا جا رہا ہے۔ چیکوسلواکیہ، کشمیر، بوسنیا، عراق، فلسطین، افغانستان، برما وغیرہ ایسے ممالک ہیں جہاں پر مسلمانوں کو ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے۔ ان محرکات کے زیرِ اثر جہاں مقامی سطح پر اس ظلم و جبر کے خلاف اظہار ہوتا ہے وہاں اردو ادب میں بھی ایسا ادب تخلیق ہوتا ہے جو ان واقعات و حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ آزادیٔ فلسطین اور اردو شاعری کو اسی تناظر میں دیکھتے ہوئے افتخار شفیع لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کا یہی ملی مزاج نہ صرف برصغیر کی مسلم قومیت کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے بل کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں موجود مظلوم مسلمانوں کے حق میں آواز اٹھانا بھی اپنے نصب العین کا حصہ سمجھتا ہے۔ مسئلہ فلسطین بہت سے اردو شعرا کو انما المومنون اخوۃ کے تحت اپنا مسئلہ دکھائی دیتا ہے، جب کہ ایک طبقہ شعرا اسے ملی جذبے سے زیادہ انسانی حقوق کے تناظر میں دیکھتا ہے، اس کی پسند کے ان معیارات میں فلسطینی تحریک آزادی کا سوویت یونین سے نظریاتی اشتراک بھی ایک وجہ ہے۔ مسئلہ فلسطین کا اظہار، یہودی ظلم و تشدد کی منظر کشی اور مظلوم فلسطینی عربوں سے اظہار یک جہتی اردو شعرا کا پسندیدہ موضوع ہے۔''(۴۱)

پروفیسر افتخار شفیع کی اس محنت شاقہ کے اعتراف میں ڈاکٹر معین الدین عقیل رقم طراز ہیں:

''ہمارے ہاں عالم اسلام کے، اور ساتھ ہی عالمی سطح کے متعدد موضوعات، مسائل تحریکات اور شخصیات پر

اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے مطالعے کی ایک روایت مستحکم ہو چکی ہے۔ اس تناظر میں عالم اسلام کے دیگر مسائل اور خود مسئلہ فلسطین بھی کئی مطالعات اور تجزیوں کا موضوع بنا ہے، لیکن افتخار شفیع صاحب نے مسئلہ فلسطین یا تحریک آزادیٔ فلسطین پر جس طرح ایک مبسوط مطالعہ تمام متعلقہ موضوعات کو شامل کرتے ہوئے سرانجام دیا ہے، اس کی مثال تا حال موجود نہیں۔ اس لحاظ سے اپنے موضوع پر افتخار شفیع کا مطالعہ ایک جامع اور مکمل کاوش ہے، جس میں موضوع کا کل احاطہ بھی کیا گیا ہے اور تجزیہ و تنقید کا ایک پختہ شعور اور مطالعہ کی وسعت کا واضح ثبوت اور اسلوب کا سلیقہ، یہ سب بھی اس میں یکجا نظر آتے ہیں۔ ان خصوصیات کے باعث 'اُردو ادب اور آزادیٔ فلسطین' کا مطالعہ جامع اور پُرکشش بھی ہو گیا ہے اور قابل مطالعہ بھی۔'' (۴۲)

اردو ادب میں اس پہلے اس مسئلے کو اس محنت، لگن اور جذبے سے کسی نے سرانجام نہیں دیا جو افتخار شفیع نے دیا ہے۔ ان کی یہ کاوش ان کے تحقیقی و تنقیدی جذبے کی غماز ہے۔

افتخار شفیع نے ''اصناف نثر'' کی تحقیق میں بڑی تحقیقی و تاریخی کتب کی ورق گردانی کی ہے۔ ایک ادب کے طالب کے لیے اس کتاب کو منظرِ عام پر لاتے ہیں جو گوہر نایاب کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو ادب کی عرق ریزی کے ساتھ ساتھ ہمعصر زبانوں کے ادب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ موضوع اور نفس مضمون کے لحاظ سے تو عام سی کتاب دیکھنے میں آتی ہے مگر کتاب کا مطالعہ کرنے سے ادب کے کئی در وا ہونے لگتے ہیں۔ تہہ در تہہ ورق کھلتے جاتے ہیں اور نئے نئے بھید منکشف ہوتے جاتے ہیں۔

افتخار شفیع نے ''اصناف نثر'' کو ایک محقق کی نظر سے دیکھتے ہوئے بڑی جزئیات سے کام لیا ہے۔ پہلے باب میں افسانوی ادب پر بات کرتے ہوئے تمثیل، داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور ڈراما کی ابتدا، ارتقا، ان کے لوازمات اور موجودہ صورت حال تک کے تمام مراحل سے گزرتے نظر آتے ہیں۔ ایک محقق کی حیثیت سے انھوں نے ایک موضوع پر مختلف ناقدین، ادبا اور محققین کی آرا کو پرکھتے ہوئے مدلل انداز میں بیان کیا ہے اور آخر پر اپنی رائے ثبت کی ہے۔ تمثیل کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تشبیہ، استعارہ، اور علامت وغیرہ محسوس و لامحسوس طریقے سے اشیا کے مشترکہ اوصاف کی دریافت کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ ان سب کا ابلاغ محض ایک جملے میں ہوتا ہے لیکن تمثیل اس کی مفصل ترین شکل ہے۔ اسے 'رمزیہ'، 'تمثیلیہ' اور 'مجازیہ' وغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔'' (۴۳)

داستان انسانی زندگی سے مربوط ہے۔ اس کا آغاز انسانی زندگی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس کے بارے میں وہ کتابوں کی عرق ریزی کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اردو نثر کی تاریخ میں 'داستان' قیمتی متاع کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نثر کی دل نشینی اور دل نوازی کی علامت ہے۔ اس نے اردو کو عظیم انشا پرداز دیے۔ یہ درست کہ داستان نے تعقل پسند سے انکار کیا، حقائق سے منہ موڑا، لیکن دل کو عقل کی پاسبانی سے ہٹ کر تنہا رہنے کا گر بھی سکھایا ہے۔'' (۴۴)

اسی طرح افتخار شفیع نے ناول کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی ابتدا اور ماخذ کے بارے میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔ مختلف ماہرین کی کی گئی تعریفوں کو سامنے رکھتے ہوئے ناول کی تعریف کی ہے۔ ناول کی اقسام، اور اس کی اجزائے ترکیبی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو ناول کی تاریخ پر دقیق نظر دوڑائی ہے۔ ناول اور ناولٹ کے درمیان حد فاصل قائم کرتے ہوئے اردو کے چند اہم ناولوں کی فہرست بھی دی ہے۔ ناولٹ کو مستقبل کی قبول عام صنف گردانتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناولٹ عصر حاضر کی پیداوار ہے۔ اس کی عمر ابھی زیادہ طویل نہیں لیکن یہ بچہ اب اپنے قدموں پر چلنے لگا ہے۔ امید ہے اس پر بھی وہ قیامت خیز جوانی بھی آجائے گی جب یہ 'یوں ہوتا تو کیا ہوتا' کے مرحلے سے آگے بڑھ کر 'ہاں میں ایسا کر سکتا ہوں' کی منزل پر پہنچ جائے گا۔'' (۴۵)

افتخار شفیع نے افسانے کی وضاحت بھی بڑے مدلل انداز میں بیان کی ہے۔ ہزاروں سال پرانے قصے کہانیوں سے ہوتے ہوئے داستان سے ناول اور پھر ناول سے افسانے تک کا سفر بڑی وضاحت سے کرتے ہیں۔ اردو افسانے پر دیگر زبانوں کے اثرات، افسانے کے لوازمات و اجزائے ترکیبی کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں اردو کے نمائندہ افسانوں کی فہرست بھی دی ہے۔ ڈراما کا تعلق بھی اصناف نثر کے افسانوی خاندان سے ہے انھوں نے اس کی جڑیں یونانی لفظ ''ڈراؤ'' تک جوڑی ہیں۔

ڈرامے کے موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو افتخار شفیع نے باقی اصناف نثر جن میں سوانح عمری، آپ بیتی، خاکہ نگاری، شعری تذکرے، سفر نامہ، رپورتاژ، انشائیہ، مضمون، کالم، خطوط، ملفوظات، تنقید اور دیگر اہم متعلقات نثر پر جدید تحقیقی انداز کو مدنظر رکھا ہے۔ حوالے وحواشی کو احسن طریقے سے استعمال کیا ہے۔ ''اصناف نثر'' ان کی ایسی محنت شاقہ ہے جو ادب کے طالب علم کے ساتھ ساتھ عام قاری کو بھی مستفید کرتی ہے۔ ان کے اسلوب میں وہ سادگی و سلاست ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے بوریت محسوس نہیں ہوتی۔

تحقیق کے میدان میں افتخار شفیع کا مطالعہ وسیع اور گہرائی و گیرائی کا حامل ہے۔ تخیل میں تامل اندیشی، صبا خرامی اور صباحت پائی جاتی ہے۔ افتخار شفیع گم گشتہ روایتوں کا امیں اور متدارک عظیم ہیں۔ تنقیدی اصولوں کے پختہ اور غیر جانب دار محقق اور نقاد ہیں۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی صلاحتیں جہاں بینی اور حق بینی پر مبنی ہیں۔ عہد شباب میں ان کی یہ کامیابیاں اور یہ صبا خرامیاں نہ صرف ان کے ادبی قد میں اضافہ کرتی ہیں بل کہ میدان تحقیق وتنقید کے جمود کو متحرک کرنے میں اہم ثابت ہوں گی۔ ان کی شخصیت سے محبت کا اظہار سیدہ صفو اپنی ایک نظم میں کچھ یوں کیا ہے:

دور تک پھیلی ہوئی رات کی پہنائی میں
تو نے جو پیار کی قندیل جلا رکھی ہے
ایک ویران سرائے میں برنگ امجد
محفل انجم و مہ تاب سجا رکھی ہے
اسی تاریکی عالم سے الجھنا ہے تجھے
اک معمہ ہے، بہر حال سلجھنا ہے تجھے (۲۶)

حوالے وحواشی

راقم کا افتخار شفیع سے گورنمنٹ کالج ساہیوال کی لائبریری میں مصاحبہ

۲ نوری، محمد فخر الحق، ڈاکٹر (مدیر)، بازیافت (شمارہ ۳۰)، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور،

۳ نوید صادق (مدیر)، سہ ماہی کارواں، بہاول پور، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء

۴ کاشر عدیل (مدیر)، اردو نامہ، مجلس زبان دفتری، لاہور، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۱ء

۵ افتخار شفیع، پاکستانی ادب کا منظر نامہ، نیگ ہوم، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۰،۱۱

۶ ڈاکٹر وحید عشرت (دیباچہ) ایضاً: ۱۰،۱۱

۷ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر، کور فلیپ، آثار جنوں (محمد افتخار شفیع)، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج، ساہیوال، ۲۰۱۰ء

۸ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ، ڈاکٹر اسلم انصاری شخصیت اور فن (محمد افتخار شفیع)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۱، ص: ۱۳۶

۹ محمد افتخار شفیع، ایضاً، ص: ۱۱

۱۰ ایضاً، ص: ۲۳

۱۱ ایضاً، ص: ۵۴

۱۲ ایضاً، ص: ۹۴

۱۳ ایضاً، ص: ۱۳۳

۱۴ محمد امین، ڈاکٹر، شہر غزل کے بعد (مضمون)، مشمولہ: سہ ماہی کارواں، بہاول پور، جلد ۳۰، شمارہ ۲۶-۲۷، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۱ء

۱۵ محمد افتخار شفیع وسید علی گیلانی (مرتبین)، ادارہ صوت ہادی، ساہیوال، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۹

۱۶ محمد امین، ڈاکٹر، شہر غزل کے بعد (مضمون)، مشمولہ: سہ ماہی کارواں، محولہ بالا

۱۷ محمد افتخار شفیع، اصناف نثر، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۳۳

۱۸ ایضاً، ص: ۷۹

۱۹ ایضاً

۲۰ محمد افتخار شفیع، اردو ادب اور آزادی فلسطین، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص: ۲۲۷

۲۱ ایضاً، ص: ۱۳۴

۲۲ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، اردو ادب اور آزادی فلسطین: ایضاً، ص: ۸

۲۳ محمد افتخار شفیع، اصناف نثر، محولہ بالا، ص: ۱۸

۲۴ ایضاً، ص: ۲۴

۲۵ ایضاً، ص: ۳۹

۲۶۔ سیدہ صفو، نظم، مشمولہ: ماہ نامہ بیاض، لاہور، مئی ۲۰۱۲ء، ص: ۱۳۳

''ریت میں ناؤ'' کے افسانوی مجموعے میں دردانہ نوشین خان کی معاشرتی عکاسی

خورشید بیگ میلسوی اہلسی

مثالی معاشرت کیا ہے؟ جہاں جان، روزی اور انسانی بنیادی ضرورتوں کی وافر فراہمی ہو۔ جہاں اقدار انسانی عروج پر ہوں۔ جہاں حق عبادت محفوظ ہو۔ علم و صحت عام ہوں وغیرہ وغیرہ۔ پاکستان سمیت 60 سے زائد اسلامی ممالک میں حاکمیت اعلیٰ خدا کو حاصل ہے۔ مگر یہ محض تصور تک محدود ہے۔ عملی طور پر موجود نہیں۔ حکمران معنوی خدا بن کر رعایا پر عرصۂ حیات تنگ کرتے ہیں۔ پھر شیطان کا بچھایا ہوا دام حرص اقدار کو نگل رہا ہے۔ ایسے لرزاں برگ کی طرح موجود معاشرے میں جب یورپ کی کالونوں کے ادوار کو یاد کرتے ہیں تو انہیں بہتر معاشرت نظر آتی ہے یا پھر وہ یورپی ممالک میں چلے جائیں یا یورپ زدہ اسلامی ممالک میں تو تب بھی وہ راحت محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جس نے اکیسویں صدی کے افسانے کو جنم دیا۔ جس میں افسانہ نویس مسرت انگیز کہانیاں دینے کی صلاحیت تو رکھتا ہے مگر اس کے اندر کا لقمان اسے روک دیتا ہے۔ تاہم فن برائے فن کے حلقے میں وہ ایسا کر ہی دیتا ہے کہ اسے اب بھی انسان کی بہار یہ خواہشوں سے محبت ہے۔ یہی کچھ محترمہ دردانہ نوشین خان کے افسانوی ''ریت کی ناؤ'' میں نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے معروف نقاد ڈاکٹر رشید امجد رقم طراز ہیں۔

''وہ کہانی تعمیر کرتے وقت جہاں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں میں پیوست رہتی ہیں وہاں کرداروں کے ذریعے قارئین کے ذہنوں میں دستک دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔''

یہ دستک فکر و فن کی آمیزش رکھتی ہے۔

''ریت میں ناؤ'' ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جس سے پہلے ان کا افسانوی مجموعہ ''پہلا زینہ'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ ''ریت میں ناؤ'' (۲۰۰۷ء) کی تخلیق ہے۔ جبکہ تیسرا افسانوی مجموعہ ''رنگ ماہی'' ۲۰۱۳ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے ناول ''اندر جال'' (۲۰۰۷ء) اور شاعری کی کتاب ''پھولوں کی رفوگری'' ۲۰۱۲ء میں اردو ادب کو تخلیقی تحائف دیے۔ ''ریت میں ناؤ'' دراصل ناامیدی کا استعارہ ہے اور میرے خیال میں ان کے افسانوی مجموعے میں شامل انیس افسانوں میں سے ''فرو ماندگی'' اس لحاظ سے بھی قابل رشک تحریر ہے کہ وہ کتاب کے عنوان کی نظری مماثلت رکھتی ہے۔ یہ چولستان کی ایک خانہ بدوش بستی کی بربادی کی داستان ہے۔ مظفر گڑھ جہاں دردانہ نوشین کا پڑاؤ ہے چولستان سے زیادہ دور نہیں۔ دردانہ انگریزی ادب کی ۸ سال استاد رہیں۔ اس لیے ان کی تحریر میں زبان مرصع و مسجع ہے۔ انھوں نے لفظوں اور تراکیب کا انتخاب نہیں کیا۔ بلکہ روانی تحریر یہ بتاتی ہے کہ انہیں خداداد صلاحیت حاصل ہے۔ غم، خوشی وغیرہ کا تاثر ان کے قلم میں غیر طبعی، غیر معمولی اور وجدانی جولانی لاتا ہے اور پھر وہ جملے بنتے ہیں جو اعلیٰ ادبی تحریر کا خاصہ ہوتے ہیں۔ یہ ''فرو ماندگی'' جہاں المیہ ہے وہاں یہ مزاحمتی رویے کی عکاس کہانی ہے۔

دردانہ نوشین خان کے ہاں کئی افسانوں میں دیگر تخلیقات میں شامل کہانیاں مزاحمتی اسلوب اور کہانی کاری کی تلخیاں بلا تعصب لیے ہوئے ہیں۔ اس کہانی کا آغاز خانہ بدوش چولستانی لڑکیوں رنگیلی اور جھمکو سے ہوتا ہے جو پیلو چننے کے بعد اپنی خود ساختہ عارضی بستی کے قدرتی کنویں کا ٹھنڈا پانی پیتے ہوئے زندگی کی بات کرتی ہیں جو وہ گزار رہی ہوتی ہیں۔ ہر مرگ پر ان کے ہاں وافر مقدار میں کھانا پکتا ہے۔ ایک اندھا حافظ ختم پڑھتا ہے۔ عام حالات میں محدود پانی اور محدود خوراک ان کی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ اس دوران بارش نہ ہونے سے سوکھا پڑنے لگتا ہے۔ تو سب کے دل و دماغ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ کنویں کے بھرنے سے ساری زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اظہار کے حوالے سے دردانہ نوشین خان کا قلم جہاں عروج پر ہوتا ہے درد و غم کی لفظی ترشی ہوئی قوسیں اور دائرے آنسوؤں کی صورت میں قاری کے رخساروں تک جا پہنچتے ہیں۔

افسانے کا ایک کردار سوکھے کے بعد جب تیز آندھی کا شکار مویشی، انسان اور اونٹوں کا قافلہ لے کر امدادی ٹیموں کے جہازوں کا ذکر کرتا ہے تو دوسرا کردار اسے یہ کہہ کر ٹوک دیتا ہے ''بندے مر رہے ہیں تجھے جہاز کی پڑی ہے۔ ہمارے بادشاہ ٹھنڈے شہروں میں سو رہے ہیں۔ کوئی جہاز ہمیں بچانے نہیں آنے والا۔''

اسی طرح جب دونوں سہیلیوں میں سے ایک کی موت ہو جاتی ہے تو جھمکو اپنی سہیلی رنگیلی کی موت پر بے اختیار ہو کر چلاتی ہے۔ ''باقی جو تھر میں بھوکے پیاسے امداد کو ترس رہے ہیں ان کو ثواب بھیجنے کا طریقہ کسی کو نہیں آتا بڑے ظالم فاضل کھڑے ہیں۔'' باوردی جوان اور افسروں کے سر افسردگی سے جھک گئے۔ یوں ان کا تلخ مزاحمتی قلم بلاتعصب مسائل کی حقیقی شہادتیں لاتے ہوئے پر کاہ لرزہ محسوس نہیں کرتا۔ اسی طرح کی کہانی ۵ مرلہ سکیم میں رہائش پذیر دو عورتیں فرحت اور ریحان کی ہیں۔ ریحانہ صحت مند بیوہ ہے جبکہ فرحت ۲۸ سالہ کنواری اور دق زدہ ہے۔ جسے پیٹ کا درد ستاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ایک ہیرو فراز اور اس کی ہیروئن کی کہانی سننے کی ریحانہ سے شوقین ہے۔ علاج کے لیے سرکاری ہسپتال جانے پر کچھ دوائی نہیں ملتی۔ کیونکہ ٹیسٹوں کے بغیر تشخیص نہیں ہو پاتی۔ یہ انسان کے جذبوں کے استحصال کی کہانی ہے۔ جس کا عنوان ''رقص آشفتہ سری'' ہے۔ ''سکون کی چوتھی سمت'' ایک سماجی المیہ ہے جہاں خونی رشتے بڑوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بوڑھی بیوہ گھر میں اکیلی ہے۔ بچے بیرون ملک سیٹل ہو چکے ہیں۔ ایک اور خوبی جو دردانہ نوشین خان کے افسانوں میں ہے معاشرے کی جدید تفہیم کا اظہار ہے۔ اسی افسانے میں موبائل اور انٹرنیٹ کے حوالے سے ان کا جملہ معنی خیز ہے۔ مگر ساری رات کون سا رشتہ مکالمہ کرتا ہے سوائے بے راہ روی کے۔

خاتون ساری رات جاگتی رہتی ہے کوئی کال نہیں آتی۔ موت کا فرشتہ آتا ہے'' بے غیرت کہیں کی'' ایک مالدار بے راہ روی کی ماری لڑکی کی کہانی ہے جو بوائے فرینڈز رکھنے، ان سے لوٹ مار کرنے، ان کے جذبات سے کھیلنے کی عادی ہے۔ یہی جدید سوسائٹی میں ہو رہا ہے اور حیران کن اینڈ یہ ہے کہ اسی لڑکی کا نکاح ایک وڈیرے نواب عمر دراز خان کے بیٹے سے ہو جاتا ہے۔ گویا ایسے کرداروں کو اس دنیا میں سزا ملنا، دردانہ نوشین خان کے نزدیک بہت کم یا پھر ناممکن ہے۔ ''مجھے سنگسار کرو'' کالج کی'' کالی لڑکی کی بربادی کی کہانی ہے۔ جو تعریف کے بول سن کر ایک بھنورے کا شکار ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنی منکوحہ کے ساتھ امریکہ روانہ ہو جاتا ہے۔'' ورطہ'' یونیورسٹی میں سائیکالوجی کے پیریڈز اور ان کے لڑکیوں کے اذہان پر اثرات اور ذاتی زندگی میں ان کے عملی تجربات کے بارے میں نوشین کا افسانہ ہے۔ اس افسانوی مجموعے کا دلچسپ ترین افسانہ ''استخارہ نیت'' ہے۔ استخارہ قدرت کا اشارہ سمجھنے کے لیے ہوتا ہے۔ جس کے بعد کسی کام کی نیت کی جاتی ہے۔ اس کہانی کے تین اہم کردار ہیں ''شہزادی گل رخ''، ''سوداگر عادل زمان'' اور ''فلسفی رابطون'' اساطیری انداز پر مہارت رکھنے والی کہانی نویس نوشین نے یہاں تخیلاتی سرزمینوں کی کہانی اس اکیسویں صدی کے مشینی دور کی ترقی میں لکھ کر تخلیق کار کے مقام بے مثال کا خوب تعین کیا ہے۔ شہزادی فلسفی کی باتیں اور شخصیت پسند کرتی ہے اور شادی کے لیے بادشاہ کے بیمار پڑنے پر دونوں امیدواروں سے تین تین آزمائشیں کی جاتی ہیں۔ ان کہانیوں کے جزئیات کا ذکر کریں تو ''باغ و بہار'' یاد آتی ہے۔ اس لحاظ سے جدت طراز دردانہ نوشین خان نے روایت سے بھی رشتہ جوڑا ہوا ہے۔ تینوں آزمائشوں میں سوداگر عادل زمان کامیاب رہتا ہے۔ فلسفی ناکام، جہاں دلچسپ اور روایت کی مٹھاس میں گندھی کہانی پڑھنے کو ملتی ہے۔ وہاں تاجر کے عملی اور فلسفی کے خیالی ہونے کا بھی قاری کو پتہ چلتا ہے۔

یوں ''ریت میں ناؤ'' کے افسانے بلاشبہ ہمارے معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی زندگی آشکار کرتے ہیں۔ جس میں زبان و بیان کا حسن ارفع و اعلیٰ انداز میں نظر آتا ہے۔ اللہ عزوجل محترمہ کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔ آمین

کوئی ہنستا دکھائی دے

(شعری مجموعہ)

سلطان سکون

صفحات 128 قیمت: 300 روپے

رحیم سنٹر، پریس مارکیٹ، فیصل آباد

حسن عباسی کی نظم کا فنی تجزیہ

نازیہ نیاز/ اوکاڑہ

حسن عباسی کی نظمیہ شاعری بھی اُن کی غزل کی طرح فنی محاسن کے اعتبار سے لائقِ تحسین ہے۔ اگر ان کی نظمیں فنی اور عروضی حوالے سے دیکھیں تو ان میں متنوع بحور کا استعمال نظر آئے گا۔ حسن عباسی فنِ عروض پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنی نظموں میں مختلف بحور کو بڑی کامیابی سے برتا ہے۔ فعلن کی بحر میں لکھی ہوئی اُن کی نظمیں بہت شاعرانہ حسن اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ جیسا کہ "آنکھیں سچی ہوتی ہیں"، "تم وہ پہلی لڑکی ہو" اور "ماں" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس طرح نظم "اُسے کہنا" بحر مفاعلین کی نہایت عمدہ مثال ہے۔

اُسے کہنا
جسے تم دوست کہتے ہو
وہ سارا دن نجانے کیسے کیسے دُکھ اُٹھاتا ہے
اُسے کہنا
ریاست جب اُجڑ جائے
تو شہزادوں پہ ایسا وقت آتا ہے

استعارے، تشبیہات، علامات، صنائع بدائع اور تلمیحات کا درست استعمال شاعری کے حسن میں اضافہ کرتا ہے اور حسن عباسی کو ان کا استعمال بہت خوبصورتی سے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری قابلِ مطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول بھی ہے۔ ادب کی نمود اور تخلیق میں حسن عباسی کی شاعری نے نکھار پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اُن کی نظم "پھولوں والے جنگل" کے بارے میں بقول انتظار حسین:

"خواب پروان چڑھنے کے لیے ایک رومانی تخیل مانگتا ہے۔ حسن عباسی کی شاعری اس دولت سے مالا مال ہے۔ اپنے رومانی تخیل کے زور پر اس شاعر نے کیا خوب دُنیا تخلیق کی ہے۔ پھول، پرندے، نیلا آسمان، سبزے کی چادر سے ڈھکی زمین، بہتا دریا، جھیلیں، جھیل میں ہلکورے لیتا چاند ان کے بیچ وہ معصوم روحیں جنھیں اس دنیا سے باہر کی دنیا کی کچھ خبر نہیں ہے۔ بس پھولوں اور جھیلوں کے بیچ بس وہ دو حقیقتوں کو جانتی ہیں۔ وصل کو اور ہجر کو ان کے سارے سکھ اور سارے دکھ ان دو تجربوں سے جنم لیتے ہیں۔"

حسن عباسی نے نظم "چاند تم سے شکایتیں ہیں بہت" میں چاند کو بطور تشبیہ اور استعارے کے اپنی نظم میں بہت خوب صورتی سے استعمال کیا ہے اور چاند کے استعارے کو بہت وسیع تناظر میں پیش کیا ہے۔

اس طرح نظم "We ar alike" میں صبح، کرنوں، شام، تارے نیلی جھیل، سبز کنارا، برف اور شرارے کا استعمال شاعری کو استعاروں سے بھرپور بناتا ہے۔ جو کہ حسن عباسی کی نظم کا امتیازی وصف ہے۔ حسن عباسی کی نظموں میں استعاروں کی بدولت گہری معنویت پیدا ہوتی ہے۔

عامر سہیل حسن عباسی کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

"حسن جتنا خوبصورت دکھتا ہے، جتنی خوبصورت باتیں کرتا ہے وہ سارا حسن اس کی تحریر میں بھی ملتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مصرعے ڈھلے ڈھلائے اور کسے ہوئے بظاہر سادہ مگر اثر انگیز۔ وہ ہمیں گنجلک، پیچیدہ اور بھول بھلیوں میں اُلجھا دینے والی تخلیق نہیں دیتا۔ فلسفیانہ گفتگو میں نہیں بھٹکاتا۔ بس جو اس کی شرارتی آنکھ دیکھتی ہے وہ بلا کم و کاست کاغذ پر انڈیل دیتا ہے۔ اس سے وہ سحر پھوٹتا ہے جو پڑھنے والے کو جکڑ لیتا ہے۔"

زبان کے ہر اچھے شاعر کی طرح حسن عباسی نے بھی استعاراتی زبان استعمال کر کے اپنی شاعری کو وسعت بخشی ہے۔

تلمیحات کا استعمال بھی شاعری کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ بہت سے دینی اور تاریخی واقعات و حقائق تلمیحات کی بدولت ہی شاعری میں آتے ہیں۔ اس لیے حسن عباسی کی شاعری میں بھی تلمیحات کا برمحل استعمال نظر آتا ہے۔ سچائی کے اظہار کے لیے واقعہ کربلا ایک تلمیح ہے اور شجاعت کا استعارہ بھی اس طرح زبان و بیان کی دوسری خوبیوں کو حسن عباسی نے کمال مہارت سے استعمال کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی نظموں میں خاص طرح کی سحر آفرینی پیدا ہو گئی ہے۔

بقول گوہر ملسیانی: "حسن عباسی اس لحاظ سے خوش قسمت شاعر ہے کہ قسامِ ازل نے اسے یہ فن ودیعت کیا ہے۔ اُس کا فن خود بولتا ہے کہ وہ ہر دلعزیز بحور کا شیدائی ہے۔ قوافی و ردیف کی موسیقیت کا داعی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں اس کی شاعری مترنم اور مسحور کن ہے۔"

حسن عباسی کی نظموں کا موضوعاتی و فکری کینوس بہت وسیع ہے۔ اُن کی شاعری کے موضوعات بھی ندرتِ خیال کے آئینہ دار ہیں اور ان کا فکر و فن بھی ادب کے جدید تقاضوں، فنی محاسن، استعارات اور خوبصورت تشبیہات سے مزین ہے۔ حسن عباسی نے نہ صرف موضوعاتی اور فکری سطح پر مراحل طے کیے ہیں بلکہ تخلیقی اور فنی جہتیں حسن عباسی کو ایسے شاعر کے طور پر سامنے لاتی ہیں جو جدید اُردو نظم کا نمائندہ ہے۔

بقول ڈاکٹر محمد عثمان: "حسن عباسی کے شعری اظہار میں ایک ندرت، تازہ کاری اور نت نئی تراکیب کے پیرائے ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جابجا شعری ساختوں میں جا بکدستی، مہارت اور جدتِ اسلوب کی جو فن کاری پائی جاتی ہے وہ کم عمر شاعروں میں قدرے ناپید ہوا کرتی ہے۔"

حسن عباسی کی نظم جدید نظم کی ہر تعریف پر پورا اُترتی ہے اور جدید نظم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بلاشبہ حسن عباسی کی شاعری ہمارے عہد میں ہونے والی شاعری میں منفرد اور دل پذیر ہے۔ حسن عباسی کا شعری مزاج مستقبل میں بھی نظم کی طرف جھکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اُمید ہے غزل میں بڑا نام بنانے کے بعد حسن عباسی نظم میں بھی بہت جلد ناقدین اور معاصرین کی نظر میں اہم اور بڑے شاعر قرار پائیں گے۔

ہندی اور اُردو عروض کا تقابلی مطالعہ

وجاہت تبسم / گجرات

ہندی اور اردو عروض کے متعلق مجھ سے کئی لوگوں نے فون پر بات کی جس کی وجہ سے میں نے اس موضوع پر مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ایسی غزلیات بے شمار شعراء میں مل جاتی ہیں اور نامور شعراء میں بھی کسی کسی کے ہاں یہ بات موجود ہے۔ جیسے فیض احمد فیض کی یہ غزل ہے۔

"اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے"

فیض کی اس غزل میں بحر متدارک اور متقارب کا اجتماع ہے۔

شعر نمبرا۔ اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے

جو قاتل تھے مقتول ہوئے، جو صید تھے اب صیاد ہوئے

فِعْل فَعُولُن فِعْل فَعُولُن

فِعْلُن فِعْلُن فِعْل فَعَلْ

مصرعہ اولی اب کے برس دس تور ستم ے

کا کا بابی زاد ہُوئے

طریقہ موسیقی داد دددادا داد

دددادا دادا دادا داد ددا

متحرک ۱۸ ساکن ۱۲

طریقہ ریاضی ۱۲ ۲۲۱ ۱۲

۲۲۱ ۲۲ ۲۲ ۱۲

۲۱ کل حروف ۳۰

فِعْلُن فِعْلُن فِعْلُن فِعِلُن

فِعْلُن فَعِلُن فِعْلُن فَعِلُن

مصرعہ ثانی جوقا تل تے مقتو ل ہوئے

جو صے دت اب صے یا د ہُوئے

طریقہ موسیقی دادا دادا دادا

دددا دادا دددا دادا

دددا متحرک ۱۹ ساکن ۱۳

طریقہ ریاضی ۲۲ ۲۲ ۲۲

۲۱۱ ۲۲ ۲۱۱ ۲۲

۲۱۱ کل حروف ۳۲

نوٹ۔ فِعْل کو بعض لوگ "فاع" بھی لکھتے ہیں وہ قانونی طور پر تو صرف عروض و ضرب میں ہی آ سکتا ہے۔ لیکن اگر شعوری یا عقلی طور پر دیکھا جائے تو صدر و ابتدا اور حشو میں بھی درست ہے۔ کیونکہ اس سے فِعْل اور فَعَل میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اس کے طریقہ موسیقی میں "دا" دال متحرک کو اور الف ساکن کو ظاہر کرتا ہے۔ طریقہ ریاضی میں "۲" کا مطلب ہے دو حروف پہلا متحرک اور دوسرا ساکن ہے "۱" کا مطلب اکیلا متحرک حرف ہے۔ طریقہ موسیقی میں غزل کے متحرک اور ساکن حروف کا فوری پتہ چل جاتا ہے۔ طریقہ ریاضی میں حروف کی تعداد فوراً گنی جا سکتی ہے۔

فیض کی غزل پر اگر عروضیوں کی رائے کو مدنظر رکھا جائے تو۔ اظہر اقبال اظہر فیض کی اس غزل پر نظریاتی طور پر متفق ہونے کے باوجود لکھتے ہیں:

"ممکن ہے کہ فیض کے ہاں یہ دو بحروں کے ملاپ سے کوئی نیا تجربہ کیا گیا ہو تا یا دانستہ طور پر متقارب، متدارک سے جا ملی ہو۔

کیونکہ اس غزل کا پہلا مصرعہ کسی صورت بھی بحر متدارک میں نہیں بلکہ بحر متقارب میں ہے جب کہ اسی غزل کے کچھ اور مصرع اور مقطع بھی بحر متقارب میں ہی ہے......... لیکن ایک سامنے کی بات ہے کہ اگر فیض نے شعوری طور پر کوئی تجربہ کیا ہوتا تو اس کی صورت کچھ اور ہوتی کیونکہ تجربے کے لیے کسی خاص پیٹرن (Pattern) کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ اس غزل میں سرے سے نہیں۔"

فیض کی اس غزل کے متعلق ڈاکٹر شفق سوپوری کہتے ہیں:

"اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے

بحر: بحرِ میر"

لیکن یہ بحرِ میر بھی نہیں ہے۔ اس بحر میں فیض نے بحر متدارک کی فروع "مفعلن" اور بحر متقارب کی فروع فعل فعولن وغیرہ کا اجتماع کیا ہے۔ بحرِ میر تقی میر نے ایسا نہیں کیا۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی: "میر نے فعلن فِعْل، فع، فعولن، فعلن کے علاوہ فعول، فَعَل بھی استعمال کیے ہیں۔" شمس الرحمٰن فاروقی نے جو فروع بیان کی ہیں یہ ساری بحر متقارب کی فروع ہیں کیونکہ فعلن ساکن العین متقارب کی بھی فروع ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم ضیاء ان فروع اور میر تقی میر کے متعلق لکھتے ہیں "فاعلن اور فَعِلن متقارب میں نہیں آ سکتے۔ لہٰذا ان تین جوڑوں یعنی فعلن۔ فعلن۔ فعل

فاعلن اور فاعلن فعل کو میر از راہِ احتیاط اپنے شعر میں نہیں لائے۔"

ڈاکٹر رابعہ سرفراز بیان کرتی ہیں:

"اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے، جو صید تھے اب صیاد ہوئے
بحر زمزمہ /متدارک مثمن مقطوع ومخبون مضاعف
وزن: فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن
نوٹ: یہ غزل اوزان ہندی

پنگل سے علاقہ رکھتی ہے تاہم اس کے مصاریع کی تقطیع بحر متدارک کے مزاحف ومضاحف سے ممکن ہے۔

اس طرح غزل اوزان کے

تمام مصاریع کی تقطیع کے دوران متحرک وساکن ارکان کی حالتیں بدلتی رہیں گی۔ہم نے اوپر اسی کے پیشِ نظر ارکان کے حروف پر اعراب نہیں لگائے۔مصاریع میں کہیں عین متحرک کے ساتھ "فَعِلُن" زیادہ دفعہ آئے گا تو کہیں ساکن العین کے ساتھ "فَعْلُن" زیادہ دفعہ آئے گا اور کہیں ان دونوں کی تعداد مع حرکت برابر ہوگی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ غزل ہندی پنگل سے علاقہ رکھتی ہے،لیکن ڈاکٹر رابعہ سرفراز نے جو بحر کا نام اور ارکان لکھے ہیں۔ان کے مطابق تو مطلع کا مصرعہ اولیٰ بھی تقطیع نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا فیض کی اس غزل کے متعلق رقم طراز ہیں:

"ایک دکنی غزل "فلسطینی بچے کی لوری" اور غزل "اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے" اوزان کی اغلاط سے پُر ہیں۔"

فیض کی اس غزل کے بارے میں سیف اللہ خالد بیان کرتے ہیں:

"یہ غزل اساسی طور پر بحر متدارک مقطوع شانزدہ رکنی میں کہی گئی ہے۔اس کے ہر مصرع میں آٹھ مرتبہ" فعلن" کا رکن موزوں ہونا چاہیے۔اس غزل کا دوسرا تیسرا اور پانچواں مصرعہ تو اسی بحر میں ہے: مگر باقی تمام مصرعوں کے آخری رکن "فعلن" کا سبب خفیف "لن" محذوف ہوگیا ہے اور باقی صرف "فع" رہ گیا ہے :یوں یہ مصرعے مجوزہ بحر سے خارج ہوگئے۔"

خالد سیف اللہ نے اس غزل پر بات درست کی ہے لیکن اس غزل میں بنیادی نقطہ یہ ہے کہ فیض نے فَعِلُن اور فعل فعولن کو اکٹھا کر دیا ہے۔اس نقطے پر مولوی نجم الغنی رقم طراز ہیں:

"پس دونوں وزنوں میں مابہ امتیاز یہ ہے کہ متقارب مثمن اثلم میں فعل اور فعولن اور فعول بھی جمع ہو سکتے ہیں۔فعولن رکن سالم ہے اور فعل اثرم ہے۔اور فعول مقبوض ہے متدارک میں نہ فعولن آسکتا ہے نہ فعل واقع ہوسکتا ہے نہ فعول کیونکہ رکن سالم اس کا فاعلن ہے اور رکن فاعلن کی کوئی فرع نہ فعل آتی ہے اور نہ فعول اور نہ فعولن"

مولوی صاحب اپنے وقت کے بڑے عروضی تھے لیکن عروض ایسا علم ہے کہ کہیں نہ کہیں غلطی ہو ہی جاتی ہے۔مولوی نجم الغنی نے جو لکھا ہے کہ متدارک کا سالم رکن فاعلن ہے اور رکن فاعلن کی کوئی فرع نہ فعل آتی ہے اور نہ فعول اور نہ فعولن۔اس میں فعول ،فعولن تو نہیں آسکتے لیکن متدارک میں "فعل "عروض وضرب میں آسکتا ہے۔فاعلن پر جب تخلیع زحاف کا عمل کریں جو خبن اور قطع کا مرکب ہے۔فاعلن میں خبن سے پہلے سبب خفیف "فا" سے الف ساقط کیا جائے تو "ف" بچ جائے گا اور آخری وتد مجموع "علن" پر قطع کا عمل کرکے وتد مجموع کے آخری ساکن حرف کو گرا کر اس سے پہلے متحرک کو ساکن کریں تو "علْ" حاصل ہوگا اور "ف عل" غیر مستعمل ہے جب اس کو مستعمل میں بدلیں گے تو "فعل" حاصل ہو جائے گا۔

اگر فیض کی اس غزل کو ہندوستانی موسیقی کے مزاج کے مطابق دیکھا جائے تو ہندی کی بحر سویا چھند اور کُند چھند میں متدارک اور متقارب کی فروع کو کسی ایک شعر میں یا ایک مصرعے میں بہ یک وقت استعمال کرنا جائز سمجھا جاتا ہے۔ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی بھانو شری چھند پر بھاکر کے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہیں کہ جو ہندی بحر کُند چھند میں ہے جس میں بحر متدارک اور متقارب کا اجتماع جائز ہے۔اس بحر میں بتیس ماترے ہوتے ہیں ۱۵ اور ۱۷ ماترا کے بعد وقفہ آتا ہے اور آخر میں فعلن ساکن العین ہے۔:

"اس چھند کا وزن وآہنگ بحر متدارک اور بحر متقارب کے ملے جلے مزاحف ارکان پر مشتمل ہے۔مثلاً

متا/ چدار/ سترا/ ساج/ کُندا/ چھندا/ سکرتا/ کیے
فعلن فعلن فعلن فاع ،فعولن فاع فعولن فعلن
رگھوبر/ اوشٹھ/ اجی/ کے/ لال، اچرن میں/ استرا/ سدا/ چت/ اودیے
فَعِلن فَعِلن فعلن فاع، فعولن فاع فعولن فاع

مصرع اول میں چدار کی 'ز' گر جائے گی اور چدا

بروزن فعْلن (ساکن العین) پڑھا جائے گا۔مصرع ثانی میں (زگھ بَ رَ) اور (وِش رَتھ) دونوں الفاظ کو جدید ہندی تلفظ کے لحاظ سے (زگھ بَرَ) اور (وِش رَتھ) بروزن فَعِلن (مکسور العین) پڑھا جائے گا۔ فاع اور فعْلن (ساکن العین) تو بحر متقارب کے سے سالم رکن فعولن کمزاحف ارکان ہیں لیکن فَعِلن (مکسور العین) بحر متدارک کے سالم فاعلن کا مزاحف رکن ہے۔ہندی چھندوں میں تو بحر متقارب اور بحر متدارک کے مزاحف یا سالم ارکان کا اجتماع جائز ہے۔''

بقول ڈاکٹر گیان چند جین:

''عربی فارسی اردو عروض میں اس وزن کے زمرے میں یہ عقد ت ہے کہ فعولن اور فعِلن دونوں کو متبادل ارکان میں نہیں لایا جاسکتا۔ ہندی میں اس وزن میں بڑی لچک ہے۔ وہاں ۱۶ ماترا کے وزن میں محض اتنی شرط کافی ہے کہ دو ماترا کے بعد دو ماترا اور تین ماترا کے بعد تین ماترا کا رکن لایا جائے۔ وہاں اس میں متعدد ارکان بھی آسکتے ہیں۔''

پروفیسر عنوان چشتی اردو اور ہندی عروض کی مماثلت سے متفق ہونے کے باوجود کہتے ہیں:

''اردو بحروں کے سنگیت میں کساوٹ یا سڈول پن ملتا ہے۔ ہندی چھندوں کی بنیاد ماتروں کی گنتی پر ہے۔ اس لئے اس میں لچک اور کسی حد تک ڈھیلا پن ہے۔''

ڈاکٹر مسیح اللہ اشرفی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''بحر متدارک یا متقارب اردو یا عربی عروض کے مطابق ان میں سے کسی بھی وزن کو قبول نہیں کرسکتی۔ ایسی صورت میں یا تو بقول پروفیسر گیان چند اردو عروض کے پیمانوں کا بل نکالا جائے یا پھر ہندی چھندوں کے اوزان کو عربی عروض میں ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ ان کو ہندی عروض کے مطابق ہی پرکھا اور استعمال کیا جائے۔''

ہندی عروض میں حرکات وسکنات کے کوئی منظم اصول نہیں ماتروں کی گنتی کی جاتی ہے اور لگھو کو گرو بنالیا جاتا ہے۔ بقول سیماب اکبر آبادی:

''صرف حروف کی گنتی کی برابر ہونے سے وزن پورا ہو جاتا تو ''اے مسیحا'' فاعلاتن مفاعیلن اور مستفعلن تینوں کے برابر ہوتا۔ لیکن یہ غلط ہے''اے مسیحا'' کسی ایک ہی وزن پر ہوسکتا ہے۔''

اس وزن میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا عروض عربی سے فارسی میں اور فارسی سے اردو میں آیا ہے۔ جب یہ ہندوستان پہنچا تو یہاں کا مقامی عروض پنگل پہلے سے موجود تھا، جس کے ملاپ سے معاملہ آپس میں گڈ مڈ ہوگیا۔

دنیا کی ہر زبان دوسری زبان سے کچھ نہ کچھ مطابقت ضرور رکھتی ہے۔ مگر دنیا کی ہر زبان کسی دوسری زبان سے مکمل میل نہیں کھاتی اور یہی حال موسیقی اور عروض کا بھی ہے۔ جو لوگ پاکستانی موسیقی کے ماہر ہیں وہ اگر اس غزل کو گنگنائیں تو انھیں بھی گنگناتے وقت دقت محسوس ہوگی، لیکن بھارت کے موسیقاروں کو یہ دقت نہیں ہوگی۔ ہر خطے کا اپنا لسانی مزاج ہوتا ہے اور اس غزل کا مزاج ہندی ہے اور جب اس غزل کو عروض عرب کے مطابق استخراج کیا جاتا ہے یا گنگنایا جاتا ہے تو بے وزن محسوس ہوتی ہے۔ عرب کا مزاج یہ نہیں ہے۔ جس کا ذکر سید علی حیدر بھی کرتے ہیں:

''فاع فعولن کو جہاں چاہا فعلن فعلن کرلیا۔ ایک وزن اسی طرح کا اور ہے فعلن فعولن فعلن فعولن۔ مثال ؎ آشوب جانی شوخ جہانی کو موزوں وخوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر عروض عرب سے اس کا استخراج نہیں ہوسکتا۔''

فارسی میں بھی فعلن یا فعل فعولن والا طریقہ مروج نہیں ہے شاذ ہی ایسا شعر مل سکتا ہے۔ بقول بدل حق حقی:

''اس بحر کو متدارک مخبون کہا گیا ہے۔ اس کی تقطیع فعلن فعلن فعلن فعلن سے کی گئی ہے۔ لیکن اس وزن میں فارسی کے اشعار زیادہ نہیں اور جو ہیں بہ تکلف موزوں کیے گئے ہیں۔ فارسی زبان میں چونکہ محدود بحاؤں سے دگی ہے اس لیے یہ وزن فارسی الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس وزن میں کبھی اچھا شعر نہیں کہا جاسکتا۔''

یہ خالص ہندی مزاج ہے اور اردو نے اس مزاج کو عربی، فارسی سے تو کہیں زیادہ قبول کرلیا ہے، لیکن مکمل طور پر قبول نہیں کیا ہے۔ البتہ پنجابی میں اردو سے بھی زیادہ مروج ہے۔ اس انوکھے تجربے کے متعلق پروفیسر مسعود حسین خاں بتاتے ہیں:

''میں نے اپنے قیام پیرس (۱۹۵۴ء) میں بحر ہزج مثمن سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن) پر عربی، فارسی اور اردو کے اشعار منتخب کرکے یہ تجربہ کیا تھا کہ ایک عرب اور ایک ایرانی دوست سے ان اشعار کو تحت اللفظ پڑھنے کو کہا۔ عرب ایرانی سے کہتا کہ تم خارج از وزن ہو جاتے ہو اور ایرانی عرب پر الزام

دھرتا ہے کہ تم شعر میں سکتہ ڈالتے ہو۔اس کے بعد میں نے اسی وزن پر اردو کا ایک شعر خود پڑھا تو دونوں مجھ پر پل پڑے کہ تم بالکل وزن سے خارج شعر پڑھ رہے ہو۔میرا یہ اصرار تھا کہ تم دونوں غلط اور میں صحیح ہوں۔

اصل صورت یہ تھی کہ عربی ، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کا اپنا اپنا لسانی مزاج اور صوتی آہنگ ہے۔ دوسرے الفاظ میں صوتی شکنجے ہیں۔
یہ شکنجے ان زبانوں کے شعری آہنگ پر اپنے اپنے طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"

بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ موزوں طبع لوگوں کی بھی مکمل گرفت نہیں ہوتی اور علم عروض سے عدم واقفیت کی وجہ سے ایک بحر سے دوسری بحر میں چلے جاتے ہیں۔مصرعے تمام موزوں ہوتے ہیں۔لیکن کوئی ایک بحر میں اور کوئی مصرعہ کسی اور بحر میں موزوں ہوتا ہے۔

غزل ترنم سے پڑھتے وقت موزوں نہیں رہتی اور ایسی غزل بے وزن سمجھی جاتی ہے۔فیض کی اس غزل پر بحث کرتے ہوئے کئی عروضیوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ممکن ہے فیض نے یہ تجربہ شعوری طور پر بھی کیا ہے۔لیکن ہمارے خطے نے اس کو قبول نہیں کیا۔

بحر متدارک میں فعول اور فعولن نہیں آسکتا ۔بحر متقارب میں فاعلن اور فعِلن متحرک العین نہیں آسکتا۔فعل اور فعْلن ساکن العین دونوں میں آسکتا ہے۔

ان اوزان میں تقطیع کرتے وقت یہ ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔جب غزل فعْلن ساکن العین پر چل رہی ہو تو اگر پہلے فعل فعولن آجائے تو سمجھ لیں یہ وزن متقارب میں داخل ہو گیا ہے۔اب فعِلن متحرک العین نہیں آئے گا۔ یہ فروع متقارب کی نہیں ہے۔اگر پہلے فعِلن آجائے تو سمجھ لیں یہ وزن متدارک میں داخل ہو گیا ہے۔اب فعل فعولن نہیں آئے گا۔فعولن تو متدارک میں آہی نہیں سکتا اور فعل بھی صدر و ابتدا یا حشو میں نہیں آتا۔ صرف عروض وضرب میں آتا ہے۔اگر ساری غزل صرف فعْلن ساکن العین پر ہو اور کہیں بھی فعل فعولن یا فعِلن متحرک العین نہ آئے تو اس غزل کو متدارک میں جگہ دینی چاہیے۔یہ متقارب کی نسبت متدارک کے زیادہ قریب ہے۔

لیکن ہندی چھندوں میں بڑی آزادیاں ہیں۔اُن میں فعل فعولن اور فعِلن متحرک العین دونوں آسکتے ہیں۔میرے خیال میں فیض کی یہ غزل اگر پاکستان میں پڑھی جائے تو بے وزن ہے۔اگر بھارت میں پڑھی جائے تو باوزن ہوگی۔

حوالہ جات:

۱۔فیض احمد فیض ،نسخہ ہائے وفا،لاہور،مکتبہ ء کارواں،س ن،ص ۶۳۶
۲۔اظہر اقبال ،اظہر ،فیض فن اور شخصیت ،غیر مطبوعہ مقالہ ایم فل ،اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۱۲،ص ۱۰۸،۱۰۹
۳۔شفق سوپوری ،ڈاکٹر ،کلام فیض کا عروضی مطالعہ ،دہلی ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۲،ص ۱۵۶
۴۔شمس الرحمٰن فاروقی ،مشمولہ ،درس بلاغت ،نئی دہلی ،ترقی اردو بیورو ،اشاعت دوئم ،۱۹۸۹ء،ص ۱۱۰
۵۔محمد اسلم ضیا،ڈاکٹر ،علم عروض اور اردو شاعری ،پاکستان ،مقتدرہ قومی زبان ،اشاعت اوّل ،۱۹۹۷ء،ص ۲۲۸
۶۔رابعہ سرفراز ،ڈاکٹر ،نسخہ ہائے وفا کی عروضی تروتیج ،فیصل آباد،سانجھ پبلی کیشنز ،۲۰۱۵ء،ص ۱۲۵
۷۔خواجہ محمد زکریا،ڈاکٹر ، چند اہم جدید شاعر ،لاہور ،سنگت پبلشرز ،۲۰۰۳ء،ص ۵۲
۸۔سیف اللہ خالد ،مشمولہ ،فیض کا فن ۔ طلسم ہوش ربا،شاہد شیدائی ،کاغذی پیرہن ،لاہور ، ماہنامہ ،مئی ،جون،۲۰۱۳ء،ص ۳
۹۔نجم الغنی ،مولوی ،بحر الفصاحت ،لاہور ،مجلس ترقی ادب،۲۰۰۶ء،ص ۱۷۷
۱۰۔سمیع اللہ اشرفی ،ڈاکٹر ،جدید مشترک اوزان ،پاکستان ،انجمن ترقی اردو ،بار اوّل ،۱۹۸۹ء،ص ۲۲۰
۱۱۔ڈاکٹر گیان چند جین ،اردو کا اپنا عروض ، لاہور ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ،بار اوّل ،۱۹۹۱ء،ص ۵۲
۱۲۔عنوان چشتی ،اردو میں کلاسیکی تنقید ،نئی دہلی ،مکتبہ جامعہ،۲۰۱۲ء،ص ۳۰
۱۳۔ڈاکٹر سمیع اللہ ،اشرفی ،جدید مشترک اوزان ،ص ۲۱۱
۱۴۔سیماب اکبر آبادی ،راز عروض ،کراچی ،پرچم پریس ،اشاعت ہفتم ،۱۹۸۵ء،ص ۱۲
۱۵۔سید علی حیدر ،تلخیص عروض و قافیہ ،حیدر آباد ،۱۹۸۲،ص ۲۰
۱۶۔ترجمہ ،بذل حق محمود ،فارسی عروض کی تنقیدی تحقیق اور اوزان غزل کے ارتقاء کا جائزہ ،لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز ،۲۰۰۵ء،ص ۱۳۶
۱۷۔پروفیسر مسعود حسین خاں ،دیباچہ ،ڈاکٹر سمیع اللہ ،اشرفی ،جدید مشترک اوزان ،ص ۱۱

مبشر سعید......فطرت کا نمائندہ

یاسر رضا آصف

انسان اور فطرت کا تعلق ہمیشہ سے بڑا اہم رہا ہے۔ مختلف مذاہب سے لے کر آج کی جدید سائنس تک انسان کسی نہ کسی صورت میں فطرت سے تخلیقی فیض حاصل کرتا رہا ہے۔ فطرت کو انسانی جذبات واحساسات کی طرح ذی روح تسلیم کیا گیا ہے۔ غم، خوشی، احترام اور محبت کے جذبات جیسا کہ انسانی دل میں موجود ہوتے ہیں۔ فطری مناظر میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ آدم کی تخلیق سے پیشتر ہی فطرت اپنی تمام تر دل کشی اور معصومیت کے ساتھ زمین و آسمان اور کائنات میں موجود تھی۔ فطرت کی اسی پاکیزگی اور تقدس نے ہی آدم کی سابقہ دنیا سے جُدائی کے غم کو کم کرنے میں مدد فراہم کی۔ یوں انسان کو شروع دن سے فطرت سے دوستی کے بدلے سُکھ اور سکون کی دولت ملی۔ فطرت کی پاکیزگی اور دل کشی کے باعث کچھ انسانوں نے اسے خُدا کا درجہ دیا تو کچھ نے خُدا کا عکس قرار دیا۔ کئی فلاسفروں کے مطابق فطرت ہی وہ اصل ہے، جس کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔

کچھ لوگ شہر کے پختہ مکانوں میں رہنے کے باوجود، تخیلاتی طور پر جنگل میں بسرام کیے ہوئے ہیں۔ وہ فطرت سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہ قدرت سے گفتگو کرتے ہیں۔ کائنات کی بھی ایک مشترکہ زبان ہے جو شخص یہ زبان سیکھ لیتا ہے وہ قدرت کی ہر شئے سے بات چیت کرنا سیکھ جاتا ہے۔ انسان ہمیشہ سے اُس کندھے کی تلاش میں رہا ہے۔ جس پر سر رکھ کر اپنا دُکھ، درد بیان کر سکے۔ ایسے انسانوں کے لیے فطرت ایک مہربان ماں کے رُوپ میں ظاہر ہوتی ہے اور خوشی خوشی اُسے اپنا کندھا فراہم کرتی ہے۔

شاعری اور فطرت میں کافی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے کلاسیکی اردو غزل میں ولی دکنی کے ہاں فطری عناصر کافی مقدار میں دکھائی دیتے ہیں۔

مبشر سعید فطرت نگاری کے ساتھ ساتھ تصویر کاری کا فن بھی جانتا ہے۔ وہ فطری منظر کو کچھ اس ادا سے شعری شکل میں ڈھالتا ہے کہ شعر ایک جیتی جاگتی تصویر کا روپ دھار لیتا ہے۔ شبنم اور اوس کو پاکیزگی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ کبھی یہ ڈالیوں اور پتوں پر موتیوں کی صورت چمکتی ہے۔ تو کبھی درختوں کے چہروں کو نکھار کرتی ہے۔ شبنم کی نمی سے اشجار کے رنگ مزید نکھر جاتے ہیں، جس سے منظر دیدہ زیب صورت اختیار کر لیتا ہے۔

رقص کرتی ہوئی بل کھاتی ہوئی ڈالی پر
آنکھ نے دیکھا ہے شبنم میں نہایا ہوا رنگ

لفظ ''شجر'' بطور علامت ایک پورا قصہ اپنے اندر سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فطرت نے اسے قربانی کا وہ جذبہ عطا کیا ہے کہ خود تو دھوپ سہتا ہے مگر دوسروں میں چھاؤں تقسیم کرتا دکھائی دیتا ہے۔

انسان کے محسوسات اگر بیدار ہو جائیں تو کئی ان کہی باتیں بھی اُسے سنائی دینے لگتی ہیں۔ کہتے ہیں کائنات کی مشترکہ زبان خاموشی ہے جو اس زبان سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے اُس پر کئی بھید کھل جاتے ہیں۔ جو کائنات کی زبان سمجھ جاتا ہے وہ ہر شئے سے کلام کرنا سیکھ جاتا ہے۔ اُس پر فطرت کی خاموشی بھی گفتگو بن کر آشکار ہونے لگتی ہے۔ مبشر سعید بھی کچھ ایسے ہی مقام پر موجود ہے۔

شجر اُداس ہیں لیکن بڑے خشوع کے ساتھ
سکوت اوڑھ کے ہر پل کلام کرتے ہیں

انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اپنی کیفیات کا عکس اُسے فطرت میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ کبھی کبھی انسان کو ایسے لگتا ہے کہ اندر کی زردی کو کسی نے باہر انڈیل دیا ہے۔ خزاں کا موسم اگر وجود میں ٹھہر جائے تو چاروں جانب ٹنڈ منڈ اشجار دکھائی دینے لگتے ہیں اور ویرانی اُس کے گرد اگرد ایک دائرے کی صورت میں مستقل بسیرا اختیار کر لیتی ہے۔ مبشر سعید کے ہاں خزاں وسیع معنوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

جس نے بخشی ہے مجھے زرد شجر سی قسمت
وہ خزاؤں کی محبت بھی بڑھائے مجھ میں

خزاں کا خوف سینے سے لگا کر
شجر، دیوار سے لپٹا ہوا ہے

زرد پتوں نے ہواؤں کی زبانی کل شب
خود سُنایا ہے ہمیں حال بھی سارا اپنا

ہجر کی کیفیت سراسر انسان کی داخلی دُنیا سے تعلق رکھتی ہے مگر اس کے برعکس فطرت سے محبت کرنے والا شخص اپنی ذات کا پرتو اردگرد کے ماحول میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ ہجر اُس کی ذات سے

نکل کر کائنات کی ہر شئے میں سرایت کر جاتا ہے اور اُسے ہر طرف جدائی کے مناظر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مبشر سعید بھی جب ایسی کیفیت سے دو چار ہوتا ہے تو فطرت میں ہجر کے کئی نشانات دیکھنے لگتا ہے۔

درختوں سے یہ پتوں کا بچھڑنا
کسی بھی طور سے اچھا نہیں تھا
دُکھ، پرندوں کی طرح شور مچا سکتے تھے
ہجر، پیڑوں سے نمودار بھی ہو سکتا تھا

جدید طرزِ حیات اور تیز رفتاری نے انسان کو جہاں سہولیات فراہم کی ہیں وہیں اُسے تنہائی اور اکلاپے کے تحفے سے بھی نوازا ہے۔ آج کا انسان اپنی ذات میں سمٹتا چلا جارہا ہے۔ آج انسان نے خود کو اس قدر مصروف کر لیا ہے کہ دوستی جیسے عظیم جذبے کے لیے بھی اُس کے پاس وقت نہیں ہے۔ یوں انسان نے اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے یا تو اپنی ذات میں پناہ لی ہے یا پھر فطرت کی آغوش میں۔ مبشر سعید بھی ایسی ہی تنہائی کا شکار ہے اس لیے پرندوں سے اپنے غم کا اظہار کرتا ہے اور پیڑوں سے دوستی کا خواہش مند نظر آتا ہے۔

کوئی میرا بھی ہو زمانے میں
یعنی پیڑوں سے دوستی کر لوں
میں پرندوں سے ہمکلام ہوا
صبح کی شبنمی اداسی میں

فطرت نگار عناصر کی سچی اور سچی تصویر اپنے الفاظ میں اُتارتا ہے۔ فطرت حسین اور سادہ ہے۔ اس کی خاموشی اپنے اندر کئی راز لیے ہے۔ یہ ایک ایسی حیرت انگیز قوت ہے جو انسان کو سکون بخشتی ہے۔ بہتا ہوا پانی فطرت کی رگوں میں دوڑتے خون کی طرح ہے جو صدیوں سے مسلسل بہتا چلا آرہا ہے اور اپنے اندر ان گنت داستانیں چھپائے ہوئے ہے۔ مبشر سعید پانی کی کہانی کو سنتا ہی نہیں بل کہ سمجھتا بھی ہے۔

بیٹھ جاتا ہوں کنارے سے لگا کر تکیہ
رات بھر مجھ کو سُناتا ہے کہانی، پانی

مبشر سعید نے فطرت کے ساتھ ایسا رابطہ استوار کیا ہے جو اس کی شاعری کو خاص اسلوب عطا کرتا ہے اور اپنے ہم عصر شعرا سے منفرد مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ جس میں تمثال نگاری کے اعلیٰ نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مبشر سعید "خواب گاہ میں ریت" کی صورت میں فطرت کے نمائندہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اگر وہ یوں ہی جانفشانی سے غزل کہتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب جدید ادب میں اپنا مقام متعین کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

معروف شاعر کرم علی کیفی کا
تازہ پنجابی شعری مجموعہ
اکو چپ چنگی اے
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
صفحات 168 قیمت 250 روپے
ناشر: فریدی ادبی سوسائٹی پاک پتن شریف

ممتاز شاعر، ناول نگار، سفر نامہ نگار اور نقاد
ممتاز راشد لاہوری کا نیا ناول
نازی نواز
شائع ہو گیا ہے
صفحات 144 قیمت 250 روپے
ملنے کا پتہ: خیال و فن پبلشر 12 ٹیپ روڈ، لاہور

ماہنامہ ارژنگ کو موصول ہونے والے رسائل

ماہنامہ **بیاض** لاہور
مدیر: عمران منظور
سید اطہر شہید روڈ، 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور

ماہنامہ **چہار سُو**، اسلام آباد
بانی و مدیر اعلیٰ: سیّد ضمیر جعفری
رابطہ: D-1 / 537 گلی نمبر 18 ویسٹریج III
راولپنڈی 46000 پاکستان

سہ ماہی **خیال و فن** لاہور
مدیر اعلیٰ: محمد ممتاز راشد
لاہور آفس: آئیڈیل ہاؤس 12 ٹیپ روڈ لاہور

سہ ماہی **شاداب** لاہور
چیف ایڈیٹر: کنول فیروز
نسبت تھامس سینٹر لاہور پارک رائے ونڈ
پوسٹ بکس نمبر 688- لاہور

سہ ماہی **تارکین وطن** لاہور
مدیر اعلیٰ: میاں منظور شاہد
علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ترکی کا سفر مبارک

ڈاکٹر طارق ہاشمی

''دریا سے صحرا تک'' کے بعد جعفر حسن مبارک کے اگلے پڑاؤ بحیرۂ اسود و بحیرۂ روم کے ساحلوں کی چھوتی سرزمین ترکیہ کا احوال ایک رُوداد کی صورت میں نذرِ قارئین ہے جو اپنے گزشتہ سفرنامے کے اسلوبیاتی اوصاف کی ایک وسعت بھی ہے۔

جغرافیائی خدوخال ہوں یا تاریخ کا حسن و جمال، ترکی بلاشبہ ہر دو اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرۂ ارض پر آباد سیاحت کے دلدادہ افراد اس خطے کا جغرافیائی و تاریخی حسن دیکھنے، کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ استنبول، انقرہ، عرفہ، قونیہ، قیصری اور ازمیر کے علاوہ متعدد شہر ایسے ہیں جو اپنے اندر آثار کا ایک خزانہ رکھتے ہیں اور دیکھنے والی آنکھیں اس خزانے سے اپنی بساط کے مطابق نظارے کھینچتی ہیں۔

ترکی کی تاریخ اور سرزمین ہند و پاک سے اس کے روابط بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ آئندہ صفحات میں آپ یہ بہت بہتر انداز میں اور مفصل طور پر ملاحظہ کریں گے۔ مجھے تو بطور شاعر یہ امر دلچسپی کا لگ رہا ہے کہ اُردو زبان کی وجہ تسمیہ ہو یا ہمارے عظیم شعرا کا نسبی و اکتسابی سلسلہ، سب کی کڑیاں ترکی سے جا ملتی ہیں۔ غالب ترکی النسل تھے اور اپنے آبا کو اپنی شاعری سے زیادہ وجہ عزت سمجھتے تھے۔ اقبال نے اپنے سر پر تاجِ فخر کے طور پر ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنی اور خود کو مرید ہندی قرار دے کر قونیہ میں آسودۂ خاک تمنا حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا مرشد تسلیم کیا۔ یہ الگ بات کہ ترکی کے قومی شاعر محمد عاکف ارصوئے اقبال کو عصرِ حاضر کا رومی سمجھتے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو افسانے کے ابتدائی آثار بھی ترکی کہانیوں سے ماخوذ ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم نے اُردو افسانے کے ابتدائی دور میں جو کہانیاں لکھیں وہ ایک ترکمان کے ترجمے قرار پائے ہیں۔

جعفر حسن مبارک کا زیرِ نظر سفرنامہ ''اپنے استنبول میں'' کا عنوان اپنے اندر ایک تہذیبی معنویت رکھتا ہے۔ تین لفظوں میں ترکی اور پاکستان کے دوطرفہ تاریخی و ثقافتی روابط کو بہ حسن و خوبی سمیٹ دیا گیا ہے۔ یہ امر بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ استنبول دراصل ''اسلام بول'' ہے جس سے مراد دینِ متین کی عظمت ہے اور ہندوستان کے برطانوی دورِ اقتدار میں یہاں کے مسلمانوں نے ترکی کے لیے جس جذبۂ دینی کا اظہار کیا تھا اُسے ترک آج تک یاد رکھے ہوئے ہیں۔

سفرنامہ کبھی میری دلچسپی کا موضوع نہیں رہا۔ اس کی ایک وجہ اس نوعیت کی تحریروں کے ذریعے بعض نا ادیبوں کی ادب میں گھسنے کی ایک کوشش ہے۔ دوسرا ذرائع ابلاغ نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ آپ گھر بیٹھے دنیا کی سیاحت کا مزا لے سکتے ہیں لیکن جعفر حسن مبارک کا تخلیقی سفر بھی میرے سامنے ہے۔ ''نئے دنوں کے خواب'' اپنے حلقۂ قارئین سے داد پا چکا ہے۔ اگرچہ جعفر حسن مبارک کی تحسین کا حوالہ اہلِ دل کے لیے اُن کی سماجی و فلاحی سرگرمیاں بھی ہیں۔ اُن کا یہ سفرنامہ میرے لیے یوں بھی دلچسپی کا سامان رکھتا ہے کہ یہ روداد محض ایک سفر کی دستاویز نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک سیاح کے احساسات شعری قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ کوئی منظر، کوئی معاملہ، کوئی کردار یا کوئی بھی نیا واقعہ جعفر حسن مبارک کو کسی شاعر کے تخلیقی جمال کی طرف متوجہ کرتا ہے اور یوں اُس کے بیان کو محض معلومات کا مجموعہ نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ ان صفحات میں معلومات اور محسوسات کا ایک امتزاج ہے۔ شعور اور شعر کی یکجائی ہے۔

جعفر حسن مبارک کا شعری ذوق بھی قدیم و جدید کی فرسودہ حدود میں بٹا ہوا نہیں ہے۔ میر، غالب، انشا اور اقبال سے لے کر دورِ جدید کے معتبر شعرا تک کے اشعار اُس کی وسعتِ ذوق کا ثبوت ہیں۔

''اپنے استنبول میں'' کے بعض واقعات نہایت دلچسپی کے حامل ہیں۔ مصنف کے رواں دواں اسلوب نے انھیں مزید دلچسپ بنا دیا ہے اور ان کے اندر حظ اُس وقت دوچند ہو جاتا ہے جب اُن واقعات کے کردار ہمیں اپنے اردگرد دکھائی دیتے ہیں لیکن جعفر حسن نے انھیں اپنے انداز میں تحرک آشنا کیا ہے۔ گویا:

؎ کچھ اصل ہے، کچھ خواب ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

''اپنے استنبول میں'' ماضی اور حال کا ایک منظر نامہ بھی ہے۔ قومیں اپنی تاریخ کس طرح مرتب کرتی ہیں۔ تاریخ سے کیا سبق سیکھتی ہیں اور اگر نہیں سیکھتیں تو کس انجام سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس نوع کے سوالات کے تناظر میں جب آپ اس سفرنامے میں ترکی کا موجودہ منظر نامہ ملاحظہ کریں گے تو یقیناً نہ صرف آپ ایک عظیم قوم کے احوال سے آگاہ ہوں گے بلکہ زمانے کی گردش کو اپنے خطے کے حوالے سے بھی سوچیں گے۔ اس لحاظ سے یہ بات قبلِ ذکر ہے کہ ترکی کی سرزمین پر پہنچنے سے قبل ہی سفرنامہ نگار کی ایک ایسے کردار سے ملاقات ہوتی ہے جس کے تجربات وطنِ عزیز کے حوالے سے کچھ زیادہ خوش گوار نہیں ہیں۔ گویا ترکی کی شان و شوکت کا مشاہدہ سفرنامہ نگار اپنے خطے کے بارے میں بہت سے سوالات کو ذہن میں رکھ کر کرتا ہے۔ اگرچہ نہ وہ خود مایوس ہے نہ ہی ترکوں کی حشمت دیکھ کر وہ کسی یاسیت کا شکار ہوتا ہے۔ البتہ دیارِ دیگر میں اپنی مٹی کی محبت سے ضرور سرشار ہے۔

یہ سفرنامہ اسلوب کے لحاظ سے رواں دواں اور شعریت کی صفات رکھنے کے ساتھ ساتھ سیلِ شعور (Stream of Conciousness) کی تکنیک کا بھی حامل ہے۔ جدید سفرنامہ نگاروں نے اس تکنیک کو اختیار کر کے سفرنامے کے اندر ادبیت کا عنصر بڑی عمدگی سے اُجاگر کیا ہے۔ جعفر حسن مبارک نے بھی اس عنصر کے باعث تاریخ اور ادب کے دریچوں میں جھانکا ہے۔ تاریخ کا دریچہ اسے عرب، ترک اور دیگر اسلامیوں کے معرکوں کی گرمی دکھاتا ہے تو ادب کے دریچے سے اُسے کئی ایک شاعروں کے شعر پاروں کے ابر پاروں کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔

''اپنے استنبول میں'' ذاتی طور پر میرے لیے رفاقت کا یوں بھی سامان رکھتا ہے کہ گزشتہ سال ترکی کے سفر میں بیشتر مناظر کا میں خود بھی ناظر تھا اور اس عرصۂ سیاحت کے خاص لمحات وہ تھے جب میں اپنے تمام قافلے والوں کو خدا حافظ کہہ کر اکیلا ہی قونیہ چل دیا تھا۔ میرے میزبان اور اہلِ کارواں کی ترجیحات میں پیر رومی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے کی حاضری شامل نہیں تھی۔ میرے لیے یہ امر بہت اطمینانِ قلب و روح کا باعث ہے کہ قونیہ میں مجھے حضرت رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اکیلا نہیں رہنے دیا۔ اس کی روداد پھر کسی وقت پر اُٹھا رکھتا ہوں۔ فی الحال یہ دلچسپ بات ضرور بتانا چاہوں گا کہ ترکوں نے جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے پہلو میں مریدِ ہندی حضرت اقبال کا بھی ایک تمثیلی مزار بنایا ہوا ہے۔ ایک پارک اور مضافی کو بھی شاعرِ مشرق سے منسوب کیا گیا ہے۔

پیر رومی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے احاطے میں بانسری کی مسلسل آواز ایک عجیب سحر پیدا کر رہی تھی اور میں آج بھی اُس کیف کو محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ محدود وقت کے باعث میں ''رقصِ درویش'' نہ دیکھ سکا۔ البتہ ان رقاصوں کے ماڈل رومی مارکیٹ سے خرید کے اپنے گھر کے ایک گوشے کی روحانی تزئین کا سامان ضرور کر لیا ہے۔

میں اپنے ان احساسات کے ساتھ آپ کو یہ سفرنامہ پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ آئندہ صفحات میں ترکی کے مناظر اور جعفر حسن مبارک کا ذوقِ شعری ایک امتزاج کے ساتھ الفاظ کے پیکروں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے آخری صفحے تک پہنچ کر آپ کا حظ اور حسرت دو چند ہو چکے ہوں گے۔

ڈاکٹر ایوب ندیم کی مشہور تصانیف

چاند میرا ہم سفر

(شعری مجموعہ)

ہوئے ہم کلام

(ادبی مشاہیر کے فکر انگیز انٹرویو)

نئے ایڈیشن دستیاب ہیں

ملنے کا پتا: ماورا بکس، 60-دی مال لاہور

معروف شاعرہ، سفرنامہ نگار اور افسانہ نویس

نیلما ناہید درانی

کی سفرنامے اور افسانوں پر مشتمل کتاب

ایک حقیقت چند افسانے

بلجیم میں بیس دن

شائع ہو گئی ہے

ملنے کا پتا: کلاسک، 42-دی مال لاہور

طنز و مزاح

قتیل شفائی

عطاء الحق قاسمی

بزرگوں اور خواتین کے بارے میں لکھنا مجھے
ہمیشہ بہت مشکل محسوس ہوتا ہے وجہ وہی
انہیں مجھیں ٹھیس لگ جائے آبگینوں کو

چنانچہ جب ''دوست'' کے جوش صاحب نے مجھے قتیل صاحب کے حوالے سے کچھ لکھنے کے لیے کہا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ کسی ''بزرگ'' سے بچ گیا ہوں۔ بس قتیل صاحب سے نیازمندی کی وجہ یہی ہے کہ ان سے مل کر بندے پر وہ یبوست طاری نہیں ہوتی جو بعض بزرگوں سے مل کر ہوتی ہے۔ قتیل شفائی مستقبل قریب میں اسی برس کے ہو جائیں گے۔ لیکن شکل و صورت سے وہ نوجوان اور اپنے رویے سے منڈے کھنڈے لگتے ہیں۔ ان سے ہر طرح کی بات کی جا سکتی ہے مثلاً یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا آپ گھر میں پانی خود گرم کرتے ہیں اور اگر خود کرتے ہیں تو اس کا مصرف کیا ہوتا ہے؟ قتیل صاحب سے ایک دفعہ میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ جب انسان تقریباً اسی برس کا ہو جاتا ہے تو وہ کون سی چیز ہے جو اس کے اندر زندہ رہنے کی خواہش بیدار رکھتی ہے؟ قتیل صاحب نے جواب دیا ''وہی چیز اسے جوان اور زندہ رکھتی ہے۔ جو آپ کے ذہن میں ہے'' لاحول ولا قوۃ حالانکہ میرے ذہن میں وہ چیز نہیں تھی جس کی طرف قتیل شفائی صاحب نے اشارہ کیا تھا' اگر میں ان کی بات سمجھ گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا اشارہ صحیح تھا ایک دفعہ یہی سوال میں نے منظور حسین یاد سے پوچھا تھا اس کے جواب میں وہ آبدیدہ ہو گئے اور میرے اس مختصر سے سوال کے جواب میں انہوں نے بیسیوں واقعات سنائے اس دوران وہ آنسو پونچھتے رہے اور توبہ استغفار کرتے رہے آخر میں انہوں نے مجھ سے بخشش کی دعا کے لئے بھی کہا اگر ان سے واقعی کوئی لغزش ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔

قتیل شفائی رند مشرب ہیں لیکن ان کی رندی محض خود پر الزام لینے والی ہے۔ اس معاملے میں وہ فیض منیر اور فراز کے برابر نہیں پہنچے اصل میں قلم کی وجہ سے ان کی صحبت جس طبقے سے رہتی ہے قتیل صاحب کو ان کی خوشنودی کے لئے یہ بھیس بدلنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی فلمی حلقوں میں شاعر کا تصور ابھی تک یہی ہے کہ وہ ہر وقت ''اک گونہ بے خودی'' کی کیفیت میں نظر آئے چنانچہ لگتا ہے قتیل صاحب ان کا دل رکھنے کے لئے آفٹر شیو کی جگہ وہ چیز استعمال کرتے ہیں جو بعض دوسرے شعراء پانی کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک اسی طرح کے شاعر سے میں نے ایک روز پوچھا ''کل آپ صحیح سلامت گھر پہنچ گئے تھے؟'' اس نے کہا ''تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو' تمہیں میری کس حرکت سے اندازہ ہوا کہ میں ''ڈرنک'' تھا تم نے دیکھا نہیں بس میں سوار ہونے کے بعد میں نے ایک خاتون کے لئے اپنی نشست خالی کی تھی؟'' میں نے عرض کیا ''اسی سے مجھے شبہ ہوا تھا کیونکہ ساری بس خالی پڑی تھی'' قتیل صاحب اس ''کرٹسی'' کا مظاہرہ عام حالات میں بھی کرتے ہیں۔

بس بزرگ خواتین کے لئے سیٹ خالی نہیں کرتے تاکہ وہ یہ سوچ کر آزردہ نہ ہوں کہ انہیں بزرگ سمجھا گیا ہے!

قتیل صاحب کی رندی کا مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ دل کی بات دل میں نہیں رکھتے زبان پر لے آتے ہیں۔ کئی مواقع پر ایسا ہوا کہ بات انہوں نے کی اور پسینہ سننے والوں کو آ گیا' جس بات کو وہ سچ سمجھتے ہیں عموماً کہہ گزرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی میزبان نے کھانا اچھا نہ پکایا تو بلاجھجک کہہ دیں گے ''حضرت! یہ آپ نے کیا جھک ماری ہے؟'' اس صاف گوئی کی ایک دفعہ مجھے اور امجد کو بہت شدید ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ جب ایک میزبان نے بغیر گوشت کے کدو کی پلیٹ اور روٹی پلانٹ کی روٹیوں کا پیکٹ دسترخوان پر سجاتے ہوئے کہا تھا'' بس اب تکلف نہ کریں اسے اپنا ہی گھر سمجھیں'' اس وقت زندگی میں پہلی دفعہ اس امر پر افسوس ہوا کہ ہم نے قتیل شفائی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ کیوں تہہ نہیں کیا؟ قتیل صاحب اس وقت ادب میں جس مقام اور مرتبے پر فائز ہیں وہ چاہیں تو پورے فخر کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ ندیم صاحب کے شاگردوں میں سے ہیں اور مجھے ان کی یہ ادا بے حد پسند ہے!

قتیل صاحب کی ایک اور خوش ادائی کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے وہ ان کا انکسار ہے۔ انہوں نے بھی خود کو عظیم حریت پسند کے طور پر پیش نہیں کیا' وہ صرف اتنی حریت پسندی کا مظاہرہ اور دعویٰ کرتے ہیں جتنی وہ ''افورڈ'' کر سکتے ہیں حالانکہ ہمارے ہاں ایک سے ایک ''حریت پسند'' موجود ہے جو ساری شاعر برادری کو بزدلی کے طعنے مارتا رہتا ہے اور شام کو ظالموں کے ساتھ ناؤنوش کی محفلوں میں شریک ہو جاتا ہے۔

آپ یقین جانیں میں قتیل صاحب کے بارے میں ابھی بے شمار باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن آٹھ بج گئے ہیں اور تقریب کا وقت بھی آٹھ بجے ہے چنانچہ میں آخر میں آج کی تقریب کے منتظمین کو تہہ دل سے مبارک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ایک ایسے شاعر کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا جس کی ادبی خدمات نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہیں۔ جس نے ایسی ایسی خوبصورت غزلیں اور گیت لکھے ہیں جنہیں بغیر کسی مبالغے کے لازوال کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس صدی کے ان اردو شعراء میں سے ہیں جس کے نام کا ڈنکا اس وقت پوری دنیا میں بج رہا ہے مگر وہ اس کے باوجود عجز و انکسار کا پیکر ہیں۔ میں دیانتداری سے محسوس کرتا ہوں کہ تاریخ ادب میں جن شعراء کا نام کسی نہ کسی حوالے سے ضرور زندہ رہے گا ان میں قتیل صاحب بھی شامل ہیں۔ چنانچہ اگر حکومت نے قتیل صاحب کو عمر کے اس حصے میں پرائڈ آف پرفارمنس دیا ہے تو ان پر نہیں ایوارڈ پر احسان کیا ہے۔ آخر میں قتیل صاحب سے معذرت کہ وقت کی کمی کی وجہ سے مجھے مضمون کا جھٹکا کرنا پڑ رہا ہے تاہم میں زیادہ فکرمند نہیں ہوں کیونکہ قتیل صاحب اکثر انڈیا جاتے رہتے ہیں۔ امید ہے اب تک وہ ''جھٹکے'' کے عادی ہو گئے ہوں گے۔ (لاہور میں ''دوست'' کے زیر اہتمام تقریب میں پڑھا گیا)

بحری قزاق

احمد سعید

پرتگال قدیم یونانی زبان سے نکلا ہوا لفظ نہیں ہے۔جس کا مطلب ہے پتہ نہیں۔ پتہ نہیں اس کا مطلب نہیں ہے بلکہ ہمیں پتہ ہی نہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔لیکن میرے نزدیک یہ یونانی اور جاپانی الفاظ کا مرکب ہے۔اس کا نام کسی زنانی نے رکھا تھا۔لیکن یہ فقط میرے ہی نزدیک ہے حقیقت کے نزدیک نہیں ہے۔ پرتگال وہ واحد ملک ہے جو کہ واحد ہے، جمع نہیں۔ کیونکہ اس نے بے شمار ملکوں پر حکومت کرکے اپنے آپ کو جمع بنا لیا تھا۔ لیکن آخرکار اپنی سلطنت ہی بچا سکا اور واحد ہو گیا۔ ویسے یہ حال صرف پرتگال کا نہیں اس میں فرانس، انگلینڈ اور کئی ممالک شامل ہیں اور اب امریکہ بھی بلی کو چھچھڑوں کے خواب کے فارمولے پر کاربند ہے۔کاربند سے مجھے اپنی ایک کار یاد آ گئی جو بند ہی اچھی لگتی تھی۔ کیونکہ اگر اُس کار کو کبھی غلطی سے چلا لیتا تو پھر وہ ایسی بند ہوتی کہ چلنے کا نام نہ لیتی ۔اس قسم سے کوئی دو قسم آگے کی موٹریں میرے دوستوں کے پاس تھیں۔ ظاہر ہے جی ''صحبت صالح طرا صالح کند''

احمد کے پاس ایک ڈبہ نما کار تھی۔ گاڑی تو نئی تھی پر دھکا جانے ہر بار ہم کیوں لگاتے تھے؟ خرم کے پاس جو موٹر سائیکل تھی وہ تھی تو خیر موٹر سائیکل ہی۔ پر کبھی پرانی سائیکل لگتی اور کبھی سائیکل بھی نہ لگتی۔ جب وہ چلتی (جبکہ اسکو دیکھ کے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ چلتی بھی ہے) تو کچھ اس قسم کی آوازیں اُس میں سے محسوس ہوتیں۔

''خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک۔''

سلمان کے گھر کار تو اچھی دکھائی دیتی لیکن اس کے لئے وہ بند ہی رہتی، چلتی جو نہ تھی۔

علی کی طرف دو کاریں تھیں پھر بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ موٹر سائیکل پر ہی پایا جاتا۔ اور موٹر سائیکل ایسی کہ چند سالوں بعد اسکی قیمت بہت بڑھ جانے والی تھی کیونکہ ایک وقت آتا ہے جب انتہائی قدیم چیزوں کی قیمتیں انتہائی بڑھ جاتی ہیں۔

جی تو پرتگال واپس آتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ اکیسویں صدی میں بھی یہ انگلش نہیں بولتے، اپنی زبان ہی بولتے ہیں۔ اپنی زبان پر فخر بھی کرتے ہیں۔ کسی ملک کے نیچے نہیں لگے۔ اپنی بیگموں کے نیچے لگے ہوں تو یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔

پرتگال کا دارالحکومت لسبن (Lisbon) ہے۔ میں اکثر غلطی سے اسے ...Lesbia بھی کہہ گیا۔ جن کے سامنے کہہ گیا سو کہہ گیا۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اور جن کے سامنے نہیں کہا (ویسے کیوں نہیں کہا)۔ اُن سے بس معذرت ۔ذہن میں اچھی طرح بٹھا لیں پھر ہی کہے گا کہ زبان سے نکلا لفظ اور کماں سے نکلا تیر بھی واپس نہیں آتا۔

Lisbon شہر میں سب کچھ ہے سوائے گول گپوں کے۔ لسبن کو یہ اپنی زبان میں Lisboa کہتے ہیں۔ Lis کا مطلب تو میں نہیں جانتا۔ بوا (boa) کا مطلب خوبصورت ہے۔ لیکن اگر آپ لڑکی کیلئے یہاں boa استعمال کریں تو اس کا بہت غلط مطلب ہے۔ لیکن یہ برا نہیں منائیں گی۔ لیکن کچھ منا بھی سکتی ہیں۔ اب منا کیا سکتی ہیں...... رنگ رلیاں، یا کچھ اور یہ مجھے اندازہ نہیں۔

''لسبن'' میں بہت زیادہ برازیلین ہیں۔ کیوں ہیں؟ اس کا سادہ سا جواب ہے کہ انگلینڈ میں پاکستانی اور انڈین کیوں ہیں۔ برازیل میں بھی پرتگیزی زبان بولی جاتی ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا شاپنگ مال لسبن میں ہی وقوع پذیر ہے۔ یہ کولمبس کی یاد میں بنایا گیا۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا یعنی یہ حرکت پرتگالیوں کی تھی۔

بھائی اپنی فیملی سمیت جب پرتگال آئے تو میں بمعہ اپنی بیگم کے ان سب کو کولمبس شاپنگ مال لے گیا۔ وہاں ایک چھوٹے سے انڈین ہوٹل پر کھانا کھا کر جو بل سامنے آیا تو مجھے اپنا شعر بھی یاد آیا

مجھ سے وے اب بل نہیں ہوتا
اس لئے تم سے مل نہیں ہوتا
کھانا اتنا کھایا ہے
مجھ سے تو اب ہل نہیں ہوتا

اگلے دن ہم سنترا (Sintra) نکلے۔ ہم کون سے ہیرے جواہرات تھے کہ کہیں سے نکلے۔ لیکن صورت خورشید تو تھے ہی ہم (اپنے ذہن

میں) کہ

''اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے''

سنترا لسبن سے پچیس منٹ کی ڈرائیو پہ ایک بہت حسین گاؤں ہے۔ جنگلات، پہاڑ اور سمندر ایک ساتھ۔ ساحل سمندر کو یہ ''پرایا'' کہتے ہیں۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں ساحل کب اپنا ہوتا ہے، سمندر کو یہ ''مار کہتے'' ہیں۔

''ساڈوں تے مارگھیاں تیریاں جدائیاں''

سنترا میں تین سے چار مشہور ساحل سمندر ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو ''بی بی سی'' نے بھی دنیا کے سب سے رومنٹک سمندروں میں سے ایک کا خطاب دیا ہے۔ اب Romantic اُس سمندر کو کہا ہے یا وہاں پہ لوگوں کی حرکات وسکنات کو یہ BBC ہی جانتا ہے۔ اُس ساحل کا نام ''پرایا دے ادگاردا'' ہے۔ ہم اتنے رومنٹک ساحل پر تو نہ جاسکے۔ ہاں البتہ ''پرایادے گراندے'' Praia de Grande پر گئے جو بہت بڑا تھا اور خوفناک بھی۔ انتہائی تیز لہریں۔ جتنا پیچھے ہوتے اگلی لہر وہیں آ جاتی۔ ساتھ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ کاش وہاں چھوٹی چھوٹی باریاں اور اُن میں پرتگیزن پیاریاں کھڑی ہوتیں۔ چلو کھڑی نہ ہوتیں بیٹھی ہی ہوتیں۔ اس سے بھی کام چل جاتا تھا۔ کام چلتا نہ چلتا میرا دماغ ضرور چل جاتا تھا۔ ساتھ ہی پیزا تھا۔ سب نے پیزا کھایا۔ میں نے پیزے، وہ بھی بڑے والے وہ بھی دو تین۔ ڈکار بھی نہ مارا پر بعد میں نعرہ ضرور مارا۔ پرتگال کے لوگوں کا رویہ بہت دوستانہ ہے۔ انڈین فلم دوستانہ کی طرح نہیں۔ لیکن یورپ میں کچھ نہیں کہا جاسکتا اور یورپ والوں کو بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ یہ اپنے باپ کی نہیں سنتے ہماری کیا خاک سنیں گے۔

سپین اور پرتگال کا میوزک ایک جیسا ہے۔ زبان جو تقریباً ایک جیسی ہے۔ کپڑوں کا فیشن بھی ایک جیسا یعنی تقریباً کپڑے نہ پہننے کا ہی رواج ہے۔ خیر یہ تو ''اَت'' پورے یورپ نے ''چکی'' ہوئی ہے۔ ات وہی اُٹھاتے ہیں جو لت (ٹانگ) اُٹھاتے ہیں۔

پرتگال کے ہمسائے میں یا سپین ہے اور یا سمندر اسی سمندر سے کولمبس اور واسکوڈے گاما جانے کیا کیا گل کھلاتے رہے جو ہم بھی جانتے ہیں اور آپ بھی۔

یہاں آج کل لوگ شوارما بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ زیادہ تر یہ کام ہمارے پاکستانیوں اور بنگالیوں نے شروع کیا ہوا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ میں نے آج کل کی بات کی ہے۔ اب آپ پرسوں جا کر دیکھیں اور وہ یہ کام نہ کر رہے ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ کیونکہ قصور ہم سب کا ہے۔ جیسے اسلام آباد، لاہور، کراچی، فیصل آباد اور پاکستان کے باقی شہر ہم سب کے ہیں اسی طرح قصور بھی ہم سب کا ہے۔ لیکن پرتگال میں کوئی قصور شہر نہیں۔ البتہ دھوبی گھاٹ ہے پر یہاں نہیں، سنگاپور میں ہے اور وہاں پہ یہ محاورہ صحیح طرح سمجھ آیا کہ ''دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا''

سفر میں پرتگیزوں سے گپ شپ لگانا بہت آسان ہے۔ کسی راستے کا پوچھیں اور پھر اور کئی کچھ پوچھیں یہاں تک کے اُنکے بارے میں پوچھنا شروع کر دیں۔ برا نہیں مناتے۔ میری زیادہ تر گفتگو یہاں کی لڑکیوں سے ہی ہوتی رہی۔ درحقیقت یہاں لڑکیاں بانسبت لڑکوں سے زیادہ ہیں۔ زیادہ تعداد میں نہیں، شکل میں زیادہ خوبصورت ہیں۔ کسی بھی قسم کی معلومات پوچھنے پر اس قدر نرم مزاجی سے پیش آتی ہیں جیسے پاکستان میں پرائیویٹ ڈاکٹر یا پرائیویٹ سکول کا پرنسپل آپ کی بھری جیب دیکھ کے پیش آتا ہے۔

پرتگیزی فٹ بال بہت کھیلتے ہیں بلکہ صرف فٹ بال ہی کھیلتے ہیں۔ کرسٹیانا رونالڈو انہی کا کھلاڑی ہے۔ میں نے ان کی سپورٹس کی دوکانوں پر جابجا پاکستانی فٹ بال دیکھے۔ اب یہ عجب بات ہے کہ فٹ بال ہمارا ہو اور کھیلیں یہ۔ ہمارے ہاں پاکستان میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ جس کی چیز ہوگی اُسے کھلائیں گے تو آپ کھیلیں گے۔ مثال کے طور پر جس لڑکے کا بلا ہو۔ اُسے ذرا نہ کھلائیں تو آپ بنا بلے کے کھیلتے رہیں پھر۔

اللہ میں صبر کروں گی

خون کے امراض میں مبتلا

معصوم فرشتوں کی سچی کہانیاں

مرتب: اظہر محمود شیخ

ملنے کا پتہ:

نستعلیق مطبوعات

غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

شاعری (غزل، نظم)

رابطوں سے نفرتوں کے راستے کم ہو گئے
ایک اک کر کے دلوں کے فاصلے کم ہو گئے
ترکِ رسمِ دوستی ہرگز مرا مسلک نہ تھا
اتفاقاً دوستوں سے رابطے کم ہو گئے
اس سے بڑھ کر زندگی میں حادثہ کوئی نہیں
زندگی کا حسن تھے جو حادثے کم ہو گئے
جب سہاروں میں رہا تو سانحے ہوتے رہے
بے سہارا ہوں تو سارے سانحے کم ہو گئے
لفظ ہے اب بھی اسی شیرینیٔ گفتار کا
ایسے لگتا ہے زباں کے ذائقے کم ہو گئے
مدتوں سے کیوں ہے صحرائے تخیل پر سکوت
آندھیوں سے واسطے کس واسطے کم ہو گئے
رو گیا خورشید میری خوش گمانی کا بھرم
خط کے آ جانے سے دل کے واہمے کم ہو گئے

خورشید بیگ میلسوی/میلسی

(مجید امجد کی نذر)

خواب کی تعبیر کوئی بھی تو حسبِ حال ہو
یوں درخشاں کوئی میرا عہدِ ماہ و سال ہو
ہر قدم پر فاصلوں کی دوریاں بڑھتی گئیں
خودسری سے کیا علاجِ دردِ اضمحلال ہو
خاکساری منزلِ مقصود تک لے جائے گی
ہاں مگر اک شرط ہے، پہلے انا پامال ہو
جی میں آتا ہے خوش و خرم رہیں، پر کیا کریں
جوئے خوں آنکھوں سے بہہ جائے جو استحصال ہو
ہاتھ آ جائے ہنر بے مدعائی کا اگر
جو نظر آتا ہے بدحال، خوش احوال ہو
ہو مجید امجد کا اسلوبِ سخن اپنا شعار
ہر گلی کوچے میں اونچا نام ساہیوال ہو
گل فشاں ہو جائے گی اُن کی پذیرائی میں جاں
وہ ریاضِ دل میں آئیں اُن کا استقبال ہو

سید ریاض حسین زیدی/ساہیوال

وہاں کے پھول کہاں، خار دینے آیا تھا
اک اور زیست کو آزار دینے آیا تھا
تمام شہر جسے میرا دوست کہتا ہے
عدو کے ہاتھ میں تلوار دینے آیا تھا
وہ، جس کی اپنی ہی ناموس تار تار ہوئی
غریبِ شہر کو دستار دینے آیا تھا
سڑک پہ لاش ہے جس بدنصیب بچے کی
ابھی ابھی مجھے اخبار دینے آیا تھا
وہ پچھلی رات یہاں اپنے خاص بندوں کو
نئی کہانی کے کردار دینے آیا تھا
بچا ہی کیا ہے مرے جسمِ ناتواں میں بھلا
وہ مجھ کو حوصلہ بے کار دینے آیا تھا
بہت ستاتا تھا بدنامیوں کا خوف اُسے
مرے خطوط مرا یار دینے آیا تھا
وہ جس کو غالبِ شوریدہ حال کہتے ہیں
غزل کے شعر کو معیار دینے آیا تھا
مرے وجود کا سایہ بھی لے گیا، غزنی
جو مجھ کو سایۂ دیوار دینے آیا تھا

محمود غزنی

یہ جو دنیا ہے تغیر کی عجب وادی ہے
حکم دیتا تھا جو کل آج وہ فریادی ہے
یہ بھی احسان ہے قاتل کا ترے بچوں پر
اس نے میت تری دہلیز پہ پہنچا دی ہے
کیا ہوا لوگ اگر بات نہیں کر سکتے
شہر میں گھومنے پھرنے کی تو آزادی ہے
میں بہت رویا تھا تو ہنستے ہوئے بچھڑا تھا
تجھ میں اور مجھ میں یہی فرق تو بنیادی ہے
دیکھیے جیت ہو کس کی وہ ستم پیشہ ہے
اور یہ دل بھی مصائب کا بہت عادی ہے
دوسری روز دکھا کر وہ چلا جاتا ہے
ایک زنجیر مرے پاؤں میں پہنا دی ہے
اس لیے تو مجھے برباد نہیں کر سکتا
مری بربادی میں شامل تری بربادی ہے
لوگ کہنے لگے غالب کو بھی آدھا شاعر
پاس ہر شخص کے اب میر کی اُستادی ہے
تری باتوں پہ یقیں کون کرے گا غزنی
شہر کا شہر اسی شوخ کا امدادی ہے

محمود غزنی/بورے والہ

دے گیا نظروں کو خوشبو کا پیام
اک حسیں کا جلوۂ بالائے بام
تب کسی بھی فن میں بنتا ہے مقام
جب کرے خود پر کوئی نیندیں حرام
ہائے اُن محروم لوگوں کی حیات
جو گزر جاتے ہیں بے نیل و مرام

دور ہوتی جائیں گی تاریکیاں
روشنی کا جتنا ہوگا انتظام
کوئی بھی جذبہ نہیں رہتا سدا
کوئی کیفیت نہیں رہتی مدام
وہ تو خود ہے نازِ گل، رشکِ چمن
جس کی خاطر ہے گلوں کا اہتمام
ہر طرف ہوگی فضائے رنگ و نور
جب کبھی ہوں گے وہ مجھ سے ہم کلام
خوبصورت ہی رہے تو خوب ہے
خوبصورت زندگی کا اختتام
دورِ حاضر میں ہے راشد اک مثال
آپ جیسا شاعرِ عالی مقام

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

حاصل ہے جس کے فضل سے چاہت کی آرزو
اس دل کو ہے اسی سے رفاقت کی آرزو
جس کے طفیل نعمتِ دنیا ہوئی نصیب
دل کو مرے ہے اُس کی عبادت کی آرزو
ہم سب گناہ گاروں، خطاکاروں کو فقط
ہوگی بروزِ حشر شفاعت کی آرزو
جب عجز و انکساری کے گوہر ہیں اپنے پاس
دینِ نبیؐ سے کیوں نہ ہو قربت کی آرزو
میں نے کہا برے کو برا، کیا برا کیا؟
ہوتی ہے سب کے دل کو صداقت کی آرزو
کھلتے رہیں گے وادیٔ دل میں وفا کے پھول
جب تک رہے گی چشمِ عنایت کی آرزو
ظاہر نہ دل شکستہ کبھی ہو محاذ پہ
رکھتا ہے یہ جمیل شجاعت کی آرزو

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

ایسا بھی ہو نگاہ ٹھکانے پہ جا لگے
اے دل! کوئی تو تیر نشانے پہ جا لگے
الزام تیرا سہنے سے میں نے کیا گریز
لیکن یہ کب کیا تھا زمانے پہ جا لگے
حصّہ میں لینے قیس کی جاگیر تک گیا
الزام کتنے میرے گھرانے پہ جا لگے
پھر زخمِ نو کو خونِ جگر بھی دیا مگر
قطرے لہو کے نقش پرانے پہ جا لگے
کشکول بھر سکے نہ اُمیدوں کے عمر بھر
حالانکہ دن تمام کمانے پہ جا لگے
روتا رہا میں رات گئے تک بھی یاد میں
آنسو تمام میرے سرہانے پہ جا لگے
اقرار میرے دور میں یہ ظلم بھی ہوا
پتھر ہر ایک آئنہ خانے پہ جا لگے

اقرار مصطفیٰ/اوکاڑہ

غیر نہیں ہے وہ تو میرا بھائی ہے
جس نے آنگن میں دیوار اُٹھائی ہے
ہجر اذیت کیسی ہے یہ اُس سے پوچھ
انگاروں پہ جس نے عمر بتائی ہے
پلکوں پہ میں کیسے آنسو آنے دوں
جانتا ہوں جب اس میں بس رُسوائی ہے
حرص ہوس اور جھوٹ سے مجھ کو نفرت ہے
جانے میرا عیب ہے یا اچھائی ہے
زادِ سفر میں اتنا ہی سامان ہے بس
یادوں کی کچھ راکھ ہے اور تنہائی ہے
محفل محفل چرچہ ہے ان شعروں کا
جس میں تیرے جلوؤں کی رعنائی ہے
پہلے خود ہی قد کو پرکھا جانچا ہے
شاہد اپنی چادر پھر پھیلائی ہے

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

کیا تقاضے ہیں محبت کے سکھاؤں تجھ کو
ہجر کا جام سرِ دشت پلاؤں تجھ کو
عارضی حسن کی بانہوں سے نکل کے آؤ
مسندِ عشق پہ ہاتھوں سے بٹھاؤں تجھ کو
میری خواہش ہے کسی روز میں اپنے دل کا
ایک خاموش پڑا درد سناؤں تجھ کو
کوئی درویش بصیرت سے بھری آنکھیں لا
ایک منظر ہے تخیل میں دکھاؤں تجھ کو
اپنی ہی ذات کے دریا سے کبھی باہر آ
پیار کے میٹھے سمندر میں بہاؤں تجھ کو
آج ہجراں کی اذیت سے بھری راتوں میں
یاد کا دیپ بنا کر میں جلاؤں تجھ کو
جو محبت کا فلک دل میں بنا رکھا ہے
اس فلک کا میں حسیں چاند بناؤں تجھ کو

مدثر محسن/ملتان

تیز سورج مرے سر پہ جو بھی آتا ہے
میرا سایہ مرے قدموں سے لپٹ جاتا ہے
ذہن پھر بیتے ہوئے حادثے دہراتا ہے
شعلۂ غم ترے چہرے سے جلا پاتا ہے
کون مرتا ہے یہاں حق و صداقت کے لیے
مجھ سا حساس بھی اس راہ سے کتراتا ہے
ظلمتِ شب میں جو جلتا رہے مٹی کا دیا
روکشِ مہرِ درخشاں وہی کہلاتا ہے
کوئی بھی اب تو نہیں حسن روایت کا امیں
آدمی وقت کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے
ہر نئی رات گزرتی ہے فکرمندی میں
ہر نیا دن نئے لاشے مجھے گنواتا ہے
وہ مری فکر کو الفاظ بھی دے گا
روح کو جسم کی پوشاک جو پہناتا ہے

/

شاعری

ہوئے جاتے ہیں سارے راستے سنسان آہٹ پر
نکل جائے نہ سینے سے ہماری جان آہٹ پر
یہ پچھلی رات کی وعدہ خلافی بھول بیٹھا ہے
اسی باعث اُچھلتا ہے دلِ نادان آہٹ پر
پریشاں کرنے کی تم کو کہاں سے پڑ گئی عادت
بھٹک جاتا ہے مجھ سا بے سرو سامان آہٹ پر
مجھے احساس نے کس موڑ پر لا کر اُتارا ہے
ترے قدموں کی ہوتی ہے مجھے پہچان آہٹ پر
خبر کیا تھی محبت میں یہ محشر بھی بپا ہوگا
دکھائی کچھ نہیں دیتا مگر ہیں کان آہٹ پر
شجاعت کی یہاں تاریخ دہراتا نہیں کوئی
یہاں تو چھوڑتے ہیں سورما میدان آہٹ پر
دھماکوں کو یہاں اب لوگ خاطر میں نہیں لاتے
کوئی ہوتا نہیں ہے آج کل حیران آہٹ پر
اسی ڈر سے میں اختر اپنی آنکھیں بند رکھتا ہوں
مرے دل کا نہ ہو جائے کہیں نقصان آہٹ پر

سلیم اختر ملک/ لاہور

پاؤں کا کانٹا نکالا نہیں جاتا ہم سے
آسماں یوں تو سنبھالا نہیں جاتا ہم سے
ہم سے دیوار گرائی نہیں جاتی کوئی
راستہ کوئی نکالا نہیں جاتا ہم سے
دیپ جلتے تھے حقارت سے بجھی توڑ دیے
ہم بجھتے تھے اُجالا نہیں جاتا ہم سے
ایسے حالات بگڑ جاتے ہیں رفتہ رفتہ
عشق کا روگ بھی پالا نہیں جاتا ہم سے

آبِ زم زم سے اگر اپنی زباں بھی دھولیں
لبِ اظہار کا چھالا نہیں جاتا ہم سے
نیند بستر سے جگائی نہیں جاتی قاسم
خواب تعبیر میں ڈھالا نہیں جاتا ہم سے

جاوید قاسم/ لاہور

تجھ کو کھو کر بھی دل رُکا ہی نہیں
دیکھ لو اس کو کچھ ہوا ہی نہیں
میں ترے بعد بھی تو زندہ ہوں
ہاں مگر مجھ میں کچھ رہا ہی نہیں
خود ہی تو توڑتے ہو سب ناطے
پھر یہ کہتے ہو کچھ کیا ہی نہیں
بن کہے جو ملے غنیمت ہے
کچھ بھی خیرات میں لیا ہی نہیں
کیوں محبت کے بدلے نفرت ہے
کیا محبت کا کچھ صلہ ہی نہیں
میں اندھیروں بھٹکتی جاتی ہوں
راستے میں کوئی دیا ہی نہیں
اتنی گہری تو میں نہیں نوشی
کیوں مجھے کوئی جانتا ہی نہیں

نوشین اقبال نوشی/ بدر مرجان

مجھے معلوم ہے

مجھے معلوم ہے تم کو بھی آخر لوٹ جانا ہے
مجھے معلوم ہے اپنی رفاقت کی کہانی مختصری ہے
مگر لمحوں کی مٹھی میں کوئی خواہش پھسلتی ریت
کی صورت میں گرتی ہے تو لگتا ہے
گزرتا وقت جیسے اب بھی میری دسترس میں ہے
کسی دوری کی آہٹ نے ابھی میرے در احساس پر
دستک نہیں دی ہے
مدار نارسائی سے کسی سیار ساعت کا
اشارہ بھی نہیں آیا
کئی ٹوٹے ہوئے تارے مرے پہلو سے کوسوں دور
اب تک ٹمٹماتے ہیں
جدائی کی صدا آنکھوں سے اوجھل ہے
مگر اک رنگ اندیشوں پہ آتا ہے تو لگتا ہے
جدائی کی گھڑی لمحوں کی پگڈنڈی کا حصہ ہے
کسی بھی موڑ پر اس سے اچانک سامنا ہوگا
مجھے معلوم ہے تم کو بھی آخر لوٹ جانا ہے
کہ رستے میں کھڑے پیڑوں کی چھاؤں رہروؤں کے
واسطے بس اک پڑاؤ ہے
تھکن اوڑھے مسافر چند گھڑیاں اور ٹھہریں گے
مجھے معلوم ہے پیڑوں کی چھاؤں رہروؤں کے
واسطے منزل نہیں ہوتی
مجھے معلوم ہے تم کو بھی اک دن لوٹ جانا ہے

ارشد نعیم/ شیخوپورہ

خط

یہ سنا ہے کہ ہجر حالت اب
تیرے چہرے پہ صاف لکھی ہے
اپنا چہرہ چھپا کے رویا کر
یاد میری اگر کبھی آئے

میرے خط کو اُٹھا کے رویا کر
میرے خط بھی تو جھوٹ نکلے ہیں
میرے خط کو جلا کے رویا کر
راکھ کو پھر لگا کے پلکوں سے
آنسوؤں سے ملا کے رویا کر
یہ نہ سمجھو کہ تجھ سے نفرت ہے
اور نہ اس کا کوئی ارادہ ہے
بوجھ پہلے بھی تھا مشقت کا
اب تو جاناں بڑا زیادہ ہے
شام ڈھلنے پہ گھر پلٹتا ہوں
سارے دن کی تھکن لیادہ ہے
میں تو خود کو بھی بھول بیٹھا ہوں
یاد کیا ہو جو تجھ سے وعدہ ہے
اپنے آنگن کی گھول کر مٹی
تجھ کو اک گھر بنا کے دیتا ہوں
ہے یہ چارہ تری اُداسی کا
کونہ کونہ سجا کے دیتا ہوں
میری آنکھیں پسند ہیں تجھ کو
اپنی آنکھیں بنا کے دیتا ہوں
ڈر اندھیرے سے تجھ کو لگتا ہے
ایک شمع جلا کے دیتا ہوں
وقت نے ہاتھ میرا تھاما ہے
تیز رفتار ہے زمانے کی
پیار کرنے کی جب نہیں فرصت
پھر ضرورت تمھیں جتانے کی
کوئی جتنا بھی غم زیادہ ہو
مجھ کو ترکیب ہے چھپانے کی
مجھ کو ماں باپ کی ہدایت ہے
مجھ کو عادت ہے مسکرانے کی

رائے عابد علی/شیخوپورہ

گریزاں سے گرویدہ

گریزاں سے گرویدہ بنتے بھنورے
ہجر سے وصال ہونے تک کا سفر
طلب کا رساؤ آرزو کی چاشنی
بخشش سے کاسنی
گل بہاری کی لجا سورج مکھی کا جھکاؤ
پو پھوٹنے تک ششدر نیناں
گریزاں سے گرویدہ ہونے تک
مہوؤں سے سلگتی شامیں مہکتی رہیں گی
رات کی رانی کا گداز گریزاں کہاں
گرویدہ نہیں گر تم
تو کیسی تخلیق جہاں؟
لبھاتی دھڑکاتی خودلذتی کا عالم
ہجر سے وصال ہونے کا سفر
لمحے ہی ساکن ہو جائیں
جب دل کا دھڑکنا بوجھل ہو
مہوؤں کی مہک جب پھیلی ہو
تو کسی گریزاں بھنورے کا
وصال حلاوت بنتا ہے
کسی گرویدہ آنچل کے آنے کی آہٹ بنتا ہے

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

برگزیدہ دھوکے

اے آہو چشم تیری طلب اور برگزیدہ دھوکے
واہور ہے ہیں مارخوروں کے ریوڑ
وہ جسموں کے فرشوں پر دیے نچاتے
حزن والم کا کوئی نوحہ گاتے
بربط کی تاروں میں سب ربط عاری
دلدل میں پھنستی کوئی اپچھا داری
زخموں پہ جیسے مرہم کے پھاہے
اور پھاہوں پہ جیسے گوٹا کناری
یہ برگزیدہ دھوکے جیسے زندہ حقیقت
جیسے زندہ گلاب......
گہری قربت کی دُھند اور جلتے سراب
مارخوروں کے سم
مارخوروں کے سینگ
وہ جسموں کے فرشوں سے اُڑتی ہوئی دھول
اے آہو چشم!
تیری طلب میں آنکھوں کے دھوکے
جیسے سینوں میں اُگتے ننھے ببول
میرے نرغے میں گل بہاری کی شاخیں
مقصد ہے ان کا ربط کا جگانا
ورنہ تیری طلب میں
کوئی برگزیدہ دھوکا کیا کھاتا؟

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

کورل آئی لینڈ کے ساتھ ایک شام

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار

میرا خیال ٹھیک ہی نکلا یعنی ٹورسٹ بس یا ٹیکسی کی بجائے مجھے بس ٹرمینل پر ہی جانا چاہیے تھا۔ ڈاکٹروں کی کانفرنس کو بنکاک ہی میں داغ مفارقت دے کر میں کورل آئی لینڈ کے حسین نظاروں کو دیکھنے نکل پڑا یعنی آپ ملاحظہ فرمائیں کہ لبرٹی مارکیٹ لاہور والے ٹور آپریٹر جس سفر کا 250 ڈالر مانگ رہے تھے وہ میں نے صرف ایک سو چھ بات دے کر بس میں طے کرنے کی ٹھان لی تھی اور مزید عیاشی یہ کہ اسی معمولی سے کرائے میں راستے کے دوران بس والوں نے مجھے منرل واٹر بھی دیا اور ایک کیک بھی پیش کیا۔

کورل آئی لینڈ کی طرف رواں دواں بس کے دونوں جانب ہمارے پنجاب ہی کی طرح دھان کے کھیت حد نظر تک دکھائی دے رہے تھے اور ظاہر ہے کہ حد نظر کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اگر کسی علاقے میں اپریل سے ستمبر تک ٹمپریچر 45 سنٹی گریڈ اور ہوا میں نمی 60 فیصد سے اوپر ہو تو چاول کی بہترین فصل کاشت کی جا سکتی ہے۔ ہمارا پنجاب، بنگلہ دیش، برما اور تھائی لینڈ کے علاقے اس لحاظ سے مثالی ہیں۔ صرف کسانوں کا رویہ اپنا اپنا ہے۔ وہاں کا کسان خوشحال ہے، مار کٹائی سے گریز کرتا ہے۔ ہمارے ہاں جب زمین فصلوں کا لباس پہنتی ہے تو اس پر ہل چلانے والے ایک دوسرے کے درپے ہو کر اپنے اور دوسروں کے لباس چیتھڑوں میں بدل دیتے ہیں۔ حالانکہ پکی فصلوں والا زمین کا سنہری لباس ہمیں رنجشوں کی بجائے پیار کی نوید دیتا ہے۔ تقریباً تین گھنٹے یہ ہریالی کے نظارے دیکھنے کے بعد ساحل سمندر کے قریب پہنچے جہاں سے تقریباً دو میل سمندر کے اندر کورل آئی لینڈ ہے۔ قیام اماری آرکیڈ ہوٹل میں تھا۔ آرکیڈ تھائی لینڈ کا قومی پھول ہے۔ اماری آرکیڈ والوں سے کہا کہ پاکستان میں بچوں سے بات کرتا ہے تو انہوں نے میں گنا یا تھ وصول کر لیے۔ میں نے انہیں کہا اس سے تو اچھا تھا دل ہی دل میں ان سے بات کر لیتے کہ یہ سچ ہے زمینی فاصلے سے زیادہ دلوں کا فاصلہ اذیت ناک ہوتا ہے۔

اماری آرکیڈ کے سامنے ساحل میں کھڑی موٹر بوٹ پر سوار ہونے لگے تو کچھ کیمرہ مین ہماری تصاویر بنا رہے تھے۔ واپسی پر پتہ چلا کہ یہ تصاویر پلاسٹک کے کور میں لگا کر دو سو باتھ میں صاحب تصویر کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں تاکہ وہ کہہ سکیں چند تصویر بتاں کچھ حسینوں کے خطوط بعد مرنے کے مرے نکلنے والے سامان میں شامل تھے۔ مجھے اپنی اک بڑی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ میں موٹر بوٹ کے اگلے حصے میں سوار تھا اور اس بوٹ کا کوچوان ایک منچلا تھائی لڑکا تھا جو طوفانی سمندری لہروں پر تیزی سے ہمیں بھگا رہا تھا۔ ہر لہر پر میں تین فٹ فضا میں اُچھلتا اور بعض اوقات نیچے لینڈ کرتا تو نیچے سیٹ موجود نہ ہوتی اس طرح ہر لہر دراصل اشک رواں کی لہر ثابت ہوئی۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہرے آپس میں جگہ بدل رہے تھے کہ سامنے بیچ سمندر کے ایک پلیٹ فارم نما بجرا نظر آیا۔ یہاں سیاح سکائی سیلنگ کر رہے تھے یعنی ایک لمبا پیراشوٹ باندھ کر اس کی رسی ایک بوٹ سے باندھتے اور کھلے سمندر میں چکر لگاتے۔ جس سے پیراشوٹ فضا میں اپنی سواری سمیت بلند ہو جاتا۔ واپس اُتارنے کے لیے بوٹ آہستہ کر کے کھڑی کرتے اور رسیاں کھینچ کر اس سمندری سانپ پر سواری کو اُتار لیتے۔ میں جب اس فضائی اُڑان کے لیے آسمان میں بلند ہوا تو یہ اک انوکھا اور حیران کن تجربہ تھا۔ ساحل کی آبادی اور سر بفلک ہوٹل اپنے نظاروں سمیت آسمان کی وسعتوں سے خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ اس اُڑان میں ٹھہرنا ممکن نہ تھا اور واقعی جو ٹھہر جائے قدرت اس کا ساتھ نہیں دیتی۔

دور کورل آئی لینڈ کا سنہرا ساحل نظر آ رہا تھا اور اس کے پیچھے پہاڑوں اور مرغزاروں کی ایک قطار تھی۔ ہمارے جو قارئین بھوربن ہوٹل گئے ہوں اور مری سے متصل اس خوبصورت ہوٹل کی ٹیرس پر بیٹھے ہوں تو سامنے والا منظر اسی کورل آئی لینڈ سے مشابہ تھا۔ موٹر بوٹ اب کورل آئی لینڈ کی طرف فراٹے بھرتی اُچھلتی کودتی جا رہی تھی مگر اب میں نے پہلی غلطی نہیں دہرائی اور اپنی فربہ کمر یا پکڑ کر سواریوں کے بیچ خود کو فٹ کر لیا۔ اب میں اپنی ساتھی سواریوں سے گھل مل گیا تھا۔ کورل آئی لینڈ کی سنہری ریت پر اترے تو لائف جیکٹ پہن کر بیچ سمندر غوطہ زن ہوئے۔ یہاں سنورکلنگ کا اپنی خاص ہیئت میں اپنا ہی مزہ ہے۔ ایک شیشے کے سلنڈر میں سمندر کی تہہ میں اُتر کر سمندری اور آبی حیات کو قریب سے دیکھنا ایک خوش کن منظر لگتا ہے۔ جب بہت سی رنگ برنگی مچھلیاں آپ کے چہرے کے پاس سے گزر جاتی ہیں۔ مجھے اس سے اک دوست کی بات یاد آئی۔ ایک ننھی مچھلی نے اپنی

ماما سے پوچھا کہ میری پیاری امی ہم مچھلیاں صرف پانی ہی میں رہ سکتی ہیں۔ Why fish can not live on earth ۔ تو بوڑھی مچھلی نے جواب دیا میری بچی!

Because selfish people live on earth and fish is not selfish.

میں واپس ساحل پر آیا تو پھر سنہری ریت سے بھرے پاؤں لیے اپنے ہم نشینوں کے پاس بیٹھ کر ان کا لایا ہوا سامان خور و نوش چٹ کر گیا۔ میں نے معاوضہ دینا چاہا تو کمال محبت سے رد کر دیا گیا۔ وہ لوگ کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرتے تھے اس لیے دل موہ لینے والے الفاظ انگلش میں ادا کر گئے تو میں نے انہیں جواباً کہا۔ جب الفاظ پر دل دھڑکے اور پھر دل دھڑکنے پر کچھ اور الفاظ خوبصورتی سے ادا ہوں تو اس لمحے کو ضرور سنبھال کر رکھیے گا کہ زندگی کی سب سے قیمتی متاع یہی ہے۔ ساحل کے پیچھے دور تک پہاڑوں کے اوپر جاتا واک کے لیے خوبصورت ٹریک جس پر چلنے کا اپنا ہی مزہ تھا، اپنا ہی نشہ تھا۔ ہم یونہی چلتے رہے تھکتے رہے پھر چلتے رہے۔ بے مقصد پھرنا بھی کبھار مقصدیت والی زندگی میں ہی سہی مزیدار تو لگتا ہے۔ اب کورل آئی لینڈ میں شام ہو چلی تھی اور یہ خوبصورت شام زندگی کا اک اثاثہ لگتی تھی۔ موٹر بوٹ والے نے واپس ساحل پر اُتارا تو صبح اُتاری گئی تصاویر خریدی گئیں۔ ہوٹل واپس جا کر سمندر کا نمکین پانی سارے جسم سے اُتارا۔ اگلے روز ساحل کے پاس ہی ایک بڑے شاپنگ پلازہ میں لنچ تھا۔ اس کی بیرونی ماتھے والی دیوار میں ایک فوکر طیارہ نصب تھا نہ جانے اسے کس طرح انہوں نے دیوار میں چن دیا تھا۔ پلازہ کے اندر نت نئی دلچسپیاں تھیں۔ میں گراؤنڈ فلور پر لان میں بیٹھ گیا۔ سامنے ہی بڑے دیدہ زیب فوارے تھے۔ ان میں سے پانی کے پائپ کی طرح دھار نکلتی جو تین فٹ کے بعد کٹ جاتی اور یہ کٹی ہوئی پانی کی لہریں شڑاپ سے فوارے کے دامن میں گرتی ہوئی ہوا میں خوبصورت لگتی تھیں۔ میں نے اسی طرح کے ٹیوسیاں مارتے فوارے سنگاپور کے ملحقہ جزیرے سنتوسہ میں دیکھے تھے۔ اس شاپنگ پلازہ کی اوپر والی منزل میں مختلف شعبے تھے جو سیاحوں کو دعوتِ نظارہ دیتے تھے۔ خصوصاً کہکشاں والا شعبہ یادگار تھا۔

اس جگہ داخل ہونے سے پہلے ہمیں دستانے اور جوتوں پر زین کے کور پہنائے گئے۔ اندر داخل ہوئے تو گھپ اندھیرا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب کچھ نقلی ہے، بہت ڈر لگتا تھا۔ اوپر دیکھا تو رات کا منظر سامنے تھا۔ تارے جھلملا رہے تھے۔ میرے سامنے قطبی تارا اور دوسری طرف دب اکبر ان کے درمیان کہکشاں صاف نظر آ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے جولائی کی کسی صاف آسمانی رات کو گاؤں میں چھت پر لیٹ کر آسمان دیکھ رہے ہیں۔ رات کے نت نئے منظر دیکھتے، اندھوں کی طرح دیواریں ٹٹولتے آخر کار میں اس طلسم خانے سے باہر آ گیا۔ مگر باہر آنے والا ہر سیاح پکار اُٹھتا تھا ”زبردست چیز بنائی گئی ہے“ اس فلور پر سامنے والے حصے میں پرانے بادشاہوں کے زمانے والے عقوبت خانے دکھائے گئے تھے۔ اس شعبہ میں ویلکم کرنے والا اہلکار بھی زندانی لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر نقلی زخم بنایا گیا تھا مگر اس خوبصورتی سے کہ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی مجھے وہ اصلی لگتا تھا۔ اندر جاں بلب قیدی تابوت میں پڑے تھے اور کسی قیدی کی کوٹھڑی سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک پرانے بلکہ پھٹے پرانے قیدی کا بازو زنداں کی سلاخوں سے باہر لٹک رہا تھا۔ تہہ خانے کی تنگی دیواریں اور شاہوں کی غلام گردشوں میں پلتی ہوئی سازشوں کی کہانیاں قیدیوں کے چہروں پر تحریر تھیں۔

اسی حصہ کے دائیں ہاتھ تھائی لینڈ کا مشہور میوزیم تھا جس میں دنیا کے مشہور و معروف لوگوں کے مومی مجسمے رکھے گئے تھے۔ جازا نے جس آدمی پر حملہ کیا تھا اس کا جسم بھی اس طرح پڑا تھا کہ ابھی اس کے زخموں سے خون رسنے لگے گا۔ ٹی وی پر ایک حیران کن خاتون دکھائی جا رہی تھی جو اپنی زبان کو تین تہوں میں لپیٹ سکتی تھی۔ کسی بھی شعبے میں حیران کن کارکردگی دکھانے والوں کے بھی مجسمے پڑے تھے۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ایک شوکیس میں ایک پاکستانی ملنگ محمد بشیر کا مجسمہ پڑا تھا جس کے پاس انگلش میں تحریر تھا ”پاکستان کے شہر لاہور میں رہنے والا یہ ملنگ وہاں کے ایک مشہور بزرگ داتا گنج بخش کے مزار پر مجاور تھا۔ اپنی کسی گستاخی کی وجہ سے اس نے خود کو اپنی طرف سے سزا دی۔ وہ 27 سال تک 40 کلو وزنی آہنی زنجیریں اپنے جسم کے ساتھ باندھے رہا۔“ یقیناً یہ ایک محیر العقول واقعہ تھا۔ میں نے ساتھی سیاحوں کو بتایا کہ یہ میرے ملک کا باشندہ تھا۔ چلیے کسی طور تو سہی میرے وطن کا نام تو دیارِ غیر میں پہنچا۔ ہماری آرکیڈ میں آج ہماری آخری شام تھی اور سامنے والے ساحل کے پار کورل آئی لینڈ کی شام تھی۔ میں نے سوچا زندگی میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا کورل آئی لینڈ کی شام میرے ساتھ ساتھ رہے گی۔

بے جان پیادہ

ایوب صابر

جالندھر کے رہائشی لکھبیر سنگھ نے اپنے بیٹوں سے کہا "میری خواہش ہے کہ میں ایک دفعہ پاکستان جاؤں تاکہ اپنی آبائی دھرتی اور گردوارہ پنجہ صاحب کے درشن کرسکوں۔" لکھبیر سنگھ کے بڑے بیٹے منجیت سنگھ نے حمایت کر دی جس پر چھوٹے بیٹے ہردیپ سنگھ نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

"باپو! آپ بیساکھی میلے پر پاکستان چلے جانا۔" منجیت سنگھ نے مشورہ دیا۔

لکھبیر سنگھ خوش ہو گیا، اب وہ بے چینی کے ساتھ بیساکھی میلے کا انتظار کرنے لگا۔ جب سے لکھبیر سنگھ نے سفر کا ارادہ کیا تھا اُس کے اندر بچپن لوٹ آیا تھا۔ وہ اکثر اپنے بچپن کو یاد کرتا تھا۔ بیساکھی میلے پر گردوارہ پنجہ صاحب کے درشن کی خواہش مچل رہی تھی۔ اُس نے بچپن میں ایک دفعہ حسن ابدال جا کر گردوارہ پنجہ صاحب کے درشن کئے تھے، وہ سوچتا تھا کہ اب حسن ابدال کیسا ہوگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وقت کے منہ زور گھوڑے کی لگام کسی نے مضبوطی سے کھینچ لی ہو جو آگے بڑھنے پر بالکل تیار نہیں تھا۔

پاکستان جانے کی تیاری بڑے جوش اور جذبے سے جاری تھی۔ جالندھر سے سردار گرمیت سنگھ کی سربراہی میں سکھ یاتریوں کا ایک جتھہ بیساکھی میلے میں شرکت کے لئے گردوارہ پنجہ صاحب کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔ لکھبیر سنگھ نے سردار گرمیت سنگھ سے اُس کی حویلی میں ملاقات کر کے جتھے کا ہمسفر بننے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سردار گرمیت سنگھ خوش ہو گیا کہ ایک بزرگ یاتری اُن کے ساتھ جائے گا۔

"لکھبیر سنگھ جی! کیا آپ نے پاسپورٹ بنوا لیا ہے؟" سردار گرمیت سنگھ نے سوال کیا۔

"میں نے تین ماہ پہلے ہی پاسپورٹ بنوا لیا تھا۔" لکھبیر سنگھ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

لکھبیر سنگھ نے جامنی رنگ کا پاسپورٹ نکال کر سردار گرمیت سنگھ کو دے دیا۔ سردار گرمیت سنگھ نے پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیا اور لکھبیر سنگھ سے کہا "آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں، میں پاکستانی ویزے کا انتظام کر کے آپ کو روانگی کی تاریخ سے مطلع کر دوں گا۔"

لکھبیر سنگھ نے گھر آ کر اپنے خاندان کو حتمی خوشخبری سنائی "میں گردوارہ پنجہ صاحب کے درشن کرنے بہت جلد پاکستان جا رہا ہوں۔" لکھبیر سنگھ کی تو خوشی کے مارے نیند ہی اڑ گئی تھی وہ خیالوں کے بردوش اکثر پاکستان پہنچ جاتا۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب لکھبیر سنگھ شوق سے زادِ سفر باندھ کر سردار گرمیت سنگھ کی رہنمائی میں اپنے خوشنما شہر جالندھر کو چھوڑ کر پاکستان کی جانب عازمِ سفر ہوا۔ لکھبیر سنگھ اکثر جالندھر سے باہر جاتا تھا لیکن آج جب وہ اپنا شہر چھوڑ رہا تھا تو ایک عجیب حسرت اور حیرت سے شہر کو دیکھ رہا تھا۔ جالندھر کی کشادہ سڑکوں کے کنارے شیشم کے ہرے بھرے درخت اُسے گلے مل کر الوداع کہنے کے لئے بے تاب نظر آ رہے تھے۔ پشپا گجرال سائنس سٹی کے باہر نصب ڈائنا سور ہاتھ ہلا کر لکھبیر سنگھ کو رخصت کر رہا تھا۔ پبلک ٹرانسپورٹ کی دھواں چھوڑتی گاڑیوں کا دھواں اُس کے نتھنوں میں گھس کر ناگواری کا احساس زندہ کر گیا۔ محمد مومن کے مقبرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اُسے یاد آیا کہ اس دنیا سے سب کو اپنی یادیں چھوڑ کر ایک دن جانا پڑتا ہے۔

جالندھر سے بس کے ذریعے اس جتھے کی منزل واہگہ بارڈر تھی۔ راستے میں لکھبیر سنگھ نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سارے مناظر اُسے پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے حالانکہ یہ نظر کا دھوکا تھا کوئی بھی منظر پیچھے کی جانب نہیں بھاگ رہا تھا بلکہ وہ خود بس میں سوار تیزی سے آگے کی جانب سفر کر رہا تھا۔ بابا گرو نانک کی بانیاں پڑھتے ہوئے جالندھر سے واہگہ تک 110 کلومیٹر سفر تقریباً دو گھنٹے میں طے ہو گیا۔ وہ لاہور کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ واہگہ بارڈر کے اُس پار لاہور شہر تھا جس کے مضافاتی علاقے میں اُس کا آبائی گاؤں کوٹ جھنڈا سنگھ تھا۔ لکھبیر سنگھ نے 15 سال کی عمر میں تقسیم ہند کے وقت اپنے آبائی گاؤں سے والدین کے ہمراہ لاکھوں لوگوں کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ ہجرت کے بعد اُس کا خاندان ہندوستانی پنجاب کے شہر جالندھر آباد ہو گیا۔

واہگہ بارڈر پر بس سے اتر کر وہ سکیورٹی کے حصار میں پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کے بعد پیدل ہی اپنے جتھے کے ساتھ واہگہ بارڈر پر نصب گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ لکھبیر سنگھ نے جونہی پاکستان کی

سرزمین پر قدم رکھا ایک خوشگوار احساس نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ باب آزادی کی دونوں اطراف بیٹھے پاکستانیوں کو ہاتھ ہلا کر امن اور دوستی کا پیغام دے رہا تھا۔ وہاں پر کچھ سکھ بھائیوں نے سردار گرمیت سنگھ اور دوسرے یاتریوں کا پنجاب کے روایتی پُر جوش انداز میں استقبال کیا۔ تمام یاتریوں کے گلے میں پیلے رنگ کے گیندے کے پھولوں سے بنے خوشنما ہار ڈالے گئے۔ سب نے ایک دوسرے کو گلے لگا کر خوب گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جسے دیکھ کر بارڈر پر بیٹھا ہر پاکستانی بھی محظوظ ہو رہا تھا۔ یاتریوں کے لئے ایک بس کا انتظام کیا گیا تھا جو واہگہ بارڈر سے حسن ابدال کی جانب روانہ ہوگئی۔

پنجاب میں ابھی گندم کی کٹائی شروع نہیں ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب سنہرے کھیت اُسے اپنے سے لگ رہے تھے۔ بس لاہور شہر میں داخل ہوئی تو لکھبیر سنگھ حیران رہ گیا، 70 سال پہلے والے لاہور اور آج کے لاہور میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لاہور کی کشادہ سڑکوں کے کنارے سلیقے سے گھاس اور پھول اُگائے گئے تھے۔ وہ جب لاہور ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے گزرا تو اُسے یاد آیا کہ لاہور ریلوے اسٹیشن کا نقشہ آج بھی ویسا ہی پُر شکوہ تھا۔ شاہی قلعہ کے ساتھ مینار پاکستان کی شان و

شوکت دیکھ کر لکھبیر سنگھ دنگ رہ گیا۔ اب وہ اپنے آبائی گاؤں کوٹ جھنڈا سنگھ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ گاؤں کی مٹی کی خوشبو اُس کی روح کو مہکا رہی تھی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس ڈرائیور راستہ بھول کر کوٹ جھنڈا سنگھ پہنچ جائے تاکہ وہ جی بھر کر ایک دفعہ پھر اپنے گاؤں کا نظارہ کر لے۔ لکھبیر سنگھ اس خیال سے خاموش تھا کہ تمام یاتری گردوارہ پنجہ صاحب پہنچنے کی جلدی میں ہیں کیونکہ کل سے بیساکھی میلے کی رسومات کا آغاز ہے ورنہ وہ سردار گرمیت سنگھ سے درخواست کرتا کہ بس کا رخ کوٹ جھنڈا سنگھ کی جانب موڑ دیا جائے۔

لاہور سے بس موٹر وے سے گزرتی ہوئی حسن ابدال کی جانب رواں دواں تھی۔ ایک مقام پر "پنجاب ریستوران" کا بورڈ نظر آیا۔ یاتریوں کو بھوک لگ رہی تھی، انہوں نے وہاں کھانے کی غرض سے قیام کیا۔ پنجاب ریستوران میں پنجاب کے روایتی کھانوں کا خصوصی اہتمام تھا۔ وہاں پر مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیوں کی بجائے چارپائیاں لگی تھیں۔ ریستوران کے مینجر نے دیکھا کہ ہندوستانی پنجاب سے سکھ یاتری اُس کے ریستوران میں مہمان بن کر آئے ہیں تو اُس نے مہمانوں کو "جی آیاں نوں" کہا اور بیروں کو آواز دی "ہمارے خاص مہمان آئے ہیں، ان کی سیوا میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا" سکھ یاتریوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ہی علاقے میں ہیں۔ من پسند کھانے کے ساتھ لسی کا بڑا گلاس ملے تو پنجاب کی روایتی خوشبو اور ذائقے سے کون لطف اندوز نہیں ہوگا۔

لاہور سے پانچ گھنٹے میں 475 کلومیٹر سفر طے کر کے بس راولپنڈی پہنچ گئی۔ یاتریوں نے گرو کا نام لے کر حسن ابدال کی طرف سفر شروع کر دیا۔ وہ شام سے پہلے گردوارہ پنجہ صاحب پہنچنے کی فکر میں تھے۔ راولپنڈی سے 50 کلومیٹر کا سفر تقریباً ایک گھنٹے میں طے ہو گیا۔ حسن ابدال پہاڑی علاقہ ہے یہاں کی خوبصورتی یاتریوں اور سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ سکھ یاتری اب گردوارہ پنجہ صاحب کے بالکل قریب تھے۔ وہ سکھ مذہب کے بانی بابا گرو نانک کی بانیاں بلند آواز میں پڑھ رہے تھے۔

بابا گرو نانک نے حسن ابدال کی ایک پہاڑی کے ساتھ 1578ء میں کچھ عرصہ قیام کیا تھا جہاں ایک پتھر پر گرو جی کے ہاتھ کا نشان موجود ہے، اسی نسبت سے اس گردوارہ کو پنجہ صاحب کہا جاتا ہے۔ سردار ہری سنگھ نلوا نے بابا گرو نانک کی یاد میں 1823ء میں یہ گردوارہ تعمیر کرایا تھا۔

شام سے پہلے یاتری گردوارہ پہنچ گئے۔ گردوارہ پنجہ صاحب کے سفید رنگ کے منقش مرکزی دروازے پر "گردوارہ سری پنجہ صاحب حسن ابدل" نام کی تختی اردو اور گورمکھی زبان میں تحریر تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہونے سے پہلے انتباہی تحریر "گردوارہ کے اندر سگریٹ، پان یا نسوار وغیرہ کا استعمال منع ہے" پر نظر پڑی جس سے عبادت گاہ کے تقدس کا احساس جاگزیں ہوا۔ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی کی دیواروں پر شیش محل کی طرز پر آئینوں کا نفیس کام کیا گیا تھا۔ گردوارہ پنجہ صاحب کی مرکزی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اتار کر سنگ مرمر کے فرش سے گزرنا پڑا جس پر تین چار انچ پانی بہہ رہا تھا۔ اس کا مقصد ہر یاتری کو اندر داخل ہونے سے پہلے پاؤں دھونا ضروری تھا۔ لکھبیر سنگھ بھی سردار گرمیت سنگھ کی رہنمائی میں جتھے کی شکل میں "جو بولے سو نہال، ست سری اکال" کا نعرہ مارتا ہوا پنجہ صاحب کے اندر داخل ہو گیا۔ مرکزی عبادت گاہ کے اردگرد دو منزلہ برآمدے تھے، ان برآمدوں میں محراب کی شکل میں چبوترے بنے تھے

جہاں کھڑے ہو کر گوردوارہ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ گوردوارہ میں دیواروں اور عمارت کے اوپر بنے گنبد پر سفید رنگ کا پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ گنبد کے اوپر سنہری رنگ کی ٹوپی بنی تھی۔ مرکزی عبادت گاہ کی دوسری منزل پر ہر دیوار میں تین سفید رنگ کے چبوترے بنے تھے، جن پر سنہری رنگ کی پتیاں سجائی گئی تھیں۔ عمارت کے ساتھ تالاب بنایا گیا تھا، سیڑھیوں کے ذریعے یاتری اس تالاب میں اتر کر اشنان کرتے تھے۔

لکھبیر سنگھ اور دوسرے یاتریوں نے تالاب میں اتر کر اشنان کیا اور گرو کے پنجے کے درشن کئے۔ اُس کے بعد ماتھا ٹیکنے کے لئے مرکزی ہال میں داخل ہو گئے، جہاں پاٹھی سنگھ گرو گرنتھ سے

بانیاں پڑھ رہے تھے اور یاتری خاموشی سے سن رہے تھے۔ ہال میں دیواروں پر شیشے اور رنگوں سے نقش و نگار بنائے گئے تھے، درمیان میں ایک خوبصورت فانوس لٹک رہا تھا جو ہال کی دلکشی میں چار چاند لگا رہا تھا۔ تمام لوگ عقیدت کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے۔ لکھبیر سنگھ نے بھی عبادت میں شامل ہو کر قلبی اطمینان حاصل کیا۔ لکھبیر سنگھ کی زندگی بھر کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔ اُس کے بعد یاتری بیساکھی میلے کے لنگر سے کھانا کھانے کے لئے چٹائیوں پر قطاروں میں بیٹھ گئے۔ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے خدمتگار میلے میں آئے یاتریوں کے سامنے ایک ایک خالی اسٹیل کی پلیٹ جس میں چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے اور ایک اسٹیل کا گلاس رکھتے گئے۔ اُس کے بعد دوسرے خدمتگار بالٹیوں میں آلو بینگن کی سبزی اور دال چنا لے کر ہاتھ میں ایک ایک ڈونگا پکڑے آ گئے۔ ہر یاتری کی پلیٹ میں سبزی اور چنے کی دال ڈال دی اور ساتھ تندوری روٹی پیش کی گئی۔ اُس کے بعد پانی کی بالٹیاں لے کر خدمتگار گلاسوں میں پانی ڈالتے گئے۔ لنگر کا انتظام اس طرح منظم انداز میں کیا گیا تھا کہ یاتری آرام اور سہولت کے ساتھ کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تین روز میلے کی گہما گہمی میں گزر گئے۔ اب یاتری واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ اگلے روز انہوں نے واپس ہندوستان روانہ ہونا تھا۔

رات کے پچھلے پہر اچانک لکھبیر سنگھ کے سینے میں درد شروع ہو گیا۔ سردار گرمیت سنگھ کو فوراً بیدار کر کے اطلاع دی گئی۔ لکھبیر سنگھ کو سول اسپتال حسن ابدال داخل کیا گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد تصدیق کی کہ لکھبیر سنگھ کو دل کا دورہ پڑا تھا لیکن وہ جانبر ہو گیا۔ ڈاکٹر نے لکھبیر سنگھ کو تین روز تک زیر نگرانی اسپتال میں رکھنے کا مشورہ دیا۔ اس حالت میں لکھبیر سنگھ سفر کے قابل نہیں تھا۔ سردار گرمیت سنگھ نے لکھبیر سنگھ کی ذمہ داری گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کی اور یاتریوں کے ساتھ ہندوستان روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر روزانہ معائنہ کر رہے تھے اور پوری توجہ سے اُس کا علاج کر رہے تھے۔ لکھبیر سنگھ دن میں کئی مرتبہ منجیت سنگھ، ہردیپ سنگھ، اپنی بہوؤں اور پوتے پوتیوں سے فون پر بات کرتا۔

لکھبیر سنگھ اُن کو تسلی دیتا کہ میں بالکل تندرست ہو کر جیسے چل کر پاکستان آیا تھا ویسے ہی اپنے پاؤں پر چل کر ہندوستان پہنچ جاؤں گا۔ وہ سوچتا کہ میں اب جتھے کا حصّہ نہیں ہوں اس لئے تندرست ہوتے ہی ہندوستان لوٹنے سے پہلے اپنے گاؤں کوٹ جھنڈا سنگھ ضرور جاؤں۔ اُسے امید تھی کہ گاؤں میں اُس کا کوئی نہ کوئی مسلمان دوست ضرور ملے گا۔

تین روز کے بعد لکھبیر سنگھ بالکل تندرست ہو کر گوردوارہ واپس آ گیا۔ اُس نے پربندھک کمیٹی کے پردھان کے سامنے اپنا گاؤں کوٹ جھنڈا سنگھ دیکھنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ پردھان نے بزرگ یاتری کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایک کار اور ڈرائیور کا انتظام کیا جو لکھبیر سنگھ کو صبح کے وقت کوٹ جھنڈا سنگھ لے جائے گا اور اگلے روز حسن ابدال واپس لائے گا۔ لکھبیر سنگھ اگلے دن منہ اندھیرے ہی ڈرائیور کے ساتھ کوٹ جھنڈا سنگھ کے لئے نکل گیا۔ جب وہ دونوں کوٹ جھنڈا سنگھ پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ گاؤں کے لوگ بوہڑ کے نیچے گرمی کی دوپہر گزارنے کے لئے بیٹھے تھے۔ لکھبیر سنگھ کار سے اترا تو لوگ اُسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اُس نے اپنے گاؤں کے لوگوں کو دیکھا تو خوشی کے مارے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لکھبیر سنگھ نے سب سے پہلے اپنا تعارف کروایا اور اپنے گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بوہڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ لکھبیر سنگھ کے ساتھ اُس کے چوبارے کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ اپنے گاؤں کے گلی کوچوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لکھبیر سنگھ گاؤں کی دیواروں کو ہاتھ لگا کر عقیدت کا اظہار کر رہا تھا، اچانک لکھبیر سنگھ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اپنے چوبارے کے سامنے کھڑے ہو کر اُس کا ضبط جواب دے چکا تھا اور لکھبیر سنگھ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ اُس نے اپنے دروازے کے اوپر ہاتھ لمبا کر کے گورمکھی

زبان میں تحریر اپنے باپ لکھبیر سنگھ کے نام کی تختی کو ہاتھ لگا کر اپنا ہاتھ چوم لیا۔ گاؤں میں کوئی گورمکھی زبان نہیں جانتا تھا اس لئے کسی کو علم ہی نہیں کہ یہ کیا لکھا ہوا تھا۔ لکھبیر سنگھ حیران تھا کہ اُن کا چوبارہ ابھی تک ویسا ہی تھا جیسا وہ 70 برس پہلے

چھوڑ کر گئے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت لدھیانہ سے ہجرت کر کے کوٹ جھنڈا سنگھ آنے کے بعد لکھبیر سنگھ کے چوبارے میں مقیم رانا نیاز نے شور سنا تو باہر نکل آیا۔ رانا نیاز نے لکھبیر سنگھ کو اجنبی نظروں سے دیکھا۔ لکھبیر سنگھ نے بتایا کہ میں جالندھر سے آیا ہوں اور یہ میرا آبائی گھر تھا۔ رانا نیاز لکھبیر سنگھ کو بڑے احترام کے ساتھ اندر لے آیا۔ لکھبیر سنگھ کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ لکھبیر سنگھ کے جگری یار غلام مصطفیٰ کو اُس کے پوتے ساجد نے بتا دیا ''لکھبیر سنگھ اپنے گھر آ گیا ہے۔'' ساجد لکھبیر سنگھ کے بارے میں اکثر اپنے دادا سے سن چکا تھا۔ غلام مصطفیٰ لکھبیر سنگھ کے گھر کی طرف خوشی خوشی روانہ ہو گیا۔ لکھبیر سنگھ کے گھر میں ایک میلہ سا لگ چکا تھا۔ غلام مصطفیٰ نے لکھبیر سنگھ کو دیکھتے ہی آواز لگائی'' اوئے میرا یار لکھو (لکھبیر سنگھ کا بچپن کا نام) آ گیا، دل ٹھنڈا ٹھار ہو گیا'' لکھبیر سنگھ نے بھی جواب میں کہا '' آجا میرے یارا سینے لگ جا'' دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ دونوں دوستوں نے 70 سال کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اُن کے لئے آنسوؤں کو روکنا بے سود تھا۔ کوٹ جھنڈا سنگھ میں جشن کا سماں تھا۔

لکھبیر سنگھ نے اپنے چوبارے کے ایک ایک کمرے کو ٹھہر ٹھہر کر دیکھا، دوپہر کے کھانے میں سرسوں کا ساگ اوپر تازہ مکھن اور مکئی کی روٹی کھا کر خوش ہو گیا۔ گاؤں کے لوگ لکھبیر سنگھ سے 70 برسوں کی کہانی سن رہے تھے۔ شام کے کھانے کے بعد لکھبیر سنگھ نے رات کو چھت پر سونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آج رات جب وہ چھت پر سویا تو کھلا آسمان اور ٹمٹماتے ستارے دیکھ کر اُس کی روح تازہ ہو گئی۔ صبح ناشتے کے بعد اُس کا دوست غلام مصطفیٰ آ گیا اور بچپن کے قصے شروع ہو گئے۔ وہ دونوں اُن لمحات کو یاد کر رہے تھے جب لکھبیر سنگھ کا خاندان ایک چھکڑے پر سامان لاد کر ہندوستان روانہ ہوا تھا۔ لکھبیر سنگھ نے جب یادوں کے پردے سرکائے تو اچانک اُسے کچھ یاد آ گیا، اُس نے رانا نیاز اور غلام مصطفیٰ سے کہا'' آپ میرے ساتھ چوبارے کے اوپر والے کمرے میں آئیں'' لکھبیر سنگھ نے

دیوار میں بنے ایک طاق کو دیکھا اور اُس کی دائیں طرف سے ایک اینٹ اکھاڑنے کے لئے کہا، رانا نیاز نے ہتھوڑی سے اینٹ اکھاڑی تو اندر سے سرخ مخمل کی ایک پوٹلی نکلی۔ لکھبیر سنگھ نے اپنے ہاتھ سے پوٹلی کھولی تو اُس کے اندر سونے کا ہار تھا۔ سونے کا ہار دیکھ کر سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لکھبیر سنگھ نے بتایا'' جب ہم ہندوستان روانہ ہوئے تو راستے کی لوٹ مار کے ڈر سے میرے باپو نے یہ ہار یہاں چھپایا تھا۔''

''اب یہ گھر آپ کا ہے تو اس ہار پر بھی آپ کا حق ہے۔'' لکھبیر سنگھ نے رانا نیاز کو ہار دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں لکھبیر سنگھ جی! یہ گھر آپ کی ملکیت تھا اور اس ہار کے مالک بھی آپ ہی ہیں۔'' رانا نیاز نے ہار واپس کرتے ہوئے کہا۔

لکھبیر سنگھ ہار دینا چاہتا تھا اور رانا نیاز لینا نہیں چاہتا تھا۔ اب اس مسئلے کا کیا حل کیا جائے۔ غلام مصطفیٰ نے گاؤں کی پنچائت بلانے کا مشورہ دیا۔ ایک گھنٹے بعد گاؤں کے باہر بوہڑ کے نیچے پنچائت ہار کا فیصلہ کرنے کے لئے بیٹھ گئی۔ پنچائت کا خیال تھا کہ ہار پر لکھبیر سنگھ کا حق ہے، اُسے ہار قبول کرنا چاہیے لیکن لکھبیر سنگھ کا کہنا تھا کہ میں یہاں ہار نہیں پیار لینے آیا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد پنچائت نے فیصلہ کیا کہ اس ہار کو فروخت کر کے کوٹ جھنڈا سنگھ کی گلیاں نالیاں پکی بنا دی جائیں۔ لکھبیر سنگھ اور رانا نیاز نے فیصلے سے اتفاق کر لیا۔ اب لکھبیر سنگھ کی واپسی کا مرحلہ تھا۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ اپنے گاؤں کوٹ جھنڈا سنگھ میں کچھ دن اور قیام کرے لیکن وہ ایک دن کے لئے آیا تھا اس لئے اب واپس جانا تھا۔ لوگوں کے ساتھ گلے ملنے سے پہلے وہ 100 سال پرانے اُس بوہڑ کے درخت سے لپٹ گیا جس کے نیچے کھیلتے ہوئے اُس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ سب سے ملنے کے بعد لکھبیر سنگھ نے اپنے دوست غلام مصطفیٰ کو گلے لگایا اور نم آنکھوں کے ساتھ کوٹ جھنڈا سنگھ سے حسن ابدال روانہ ہو گیا۔

گوردوارہ پنجہ صاحب میں پانچ روز قیام کے بعد لکھبیر سنگھ نے ہندوستان جانے کی تیاری

کر لی۔ اچانک لکھبیر سنگھ کو دوبارہ دل کا دورہ پڑا، اُسے سول اسپتال حسن ابدال داخل کیا گیا لیکن 85 سالہ بزرگ اسپتال پہنچتے ہی دم توڑ گیا۔ گوردوارہ میں یہ افسوسناک خبر سن کر ہر یاتری غمزدہ ہو گیا۔ پربندھک کمیٹی کے پردھان نے اسپتال آ کر لاش دیکھنے کے بعد اُسے اسپتال کے سرد خانے میں رکھنے کی درخواست کی، اس طرح یاترہ کے لئے ہندوستان

سے خوشی اور گرمجوشی کے ساتھ آنے والا لکھبیر سنگھ اسپتال کے سرد خانے پہنچ گیا۔ پردھان نے ہندوستان میں لکھبیر سنگھ کے بیٹوں منجیت سنگھ اور ہردیپ سنگھ کو اس سانحے کی اطلاع کردی۔ لکھبیر سنگھ کا سارا خاندان وفات کی خبر سن کر رونے لگا۔

گردوارہ پربندھک کمیٹی کے پردھان لکھبیر سنگھ کی لاش کو ہندوستان پہنچانے کی کاغذی کارروائی مکمل کرنے لگ گئے۔ اسپتال، ہندوستانی ایمبیسی اور پربندھک کمیٹی کی کوششوں سے چار روز میں تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ پردھان نے لکھبیر سنگھ کے خاندان کو اطلاع کردی کہ کل دوپہر لکھبیر سنگھ کی لاش واہگہ بارڈر پہنچا دی جائے گی، آپ وہاں آ کر لاش وصول کرلیں۔ اگلے روز منجیت سنگھ اور ہردیپ سنگھ نم آنکھوں کے ساتھ اپنے باپو کا تابوت وصول کرنے کے لئے کھڑے تھے۔

لکھبیر سنگھ کا تابوت واہگہ بارڈر پر پہنچا دیا گیا۔ پاکستانی حکام نے معمول کی کارروائی کے بعد تابوت پاکستان رینجرز کے حوالے کر دیا۔ پاکستان رینجرز کے چار جوانوں نے بڑے احترام کے ساتھ کندھوں پر اٹھا کر تابوت پاکستان اور ہندوستان کی سرحدی لکیر کے اوپر اس طرح رکھا کہ لکھبیر سنگھ کا سر اور دھڑ پاکستان میں، پاؤں اور ٹانگیں ہندوستان کی سرزمین پر تھیں۔ بی ایس ایف کے جوان تابوت وصول کرنے میں تذبذب کا شکار نظر آئے۔ کسٹم اور امیگریشن حکام کی طرف سے کاغذات کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی۔ لکھبیر سنگھ کے دونوں بیٹے اس انتظار میں تھے کہ بی ایس ایف کے حکام تابوت سرحدی لکیر سے اٹھا کر ہمارے حوالے کریں تاکہ ہم جالندھر روانہ ہو سکیں۔

جب کافی دیر تک ہندوستانی حکام کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی تو پاکستان رینجرز کے افسر عبدالقادر نے بی ایس ایف کے افسر کے ایل شرما سے ہاٹ لائن پر رابطہ کر کے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو وہاں سے حیلوں بہانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

''لکھبیر سنگھ کے ویزے کی تاریخ انتہاء (expiry date) گزر چکی ہے۔'' کے ایل شرما نے اعتراض اٹھایا۔

''ویزے کی تاریخ انتہاء ہی نہیں گزری، بے حسی کی تاریخ بھی انتہاء سے گزر چکی ہے۔ آپ جس آدمی کے ویزے کی expiry date کا ایشو اٹھا رہے ہیں وہ خود بھی expire ہو چکا ہے، آپ لکھبیر سنگھ کا موت نامہ دیکھیے، اُس کے مطابق لکھبیر سنگھ کی موت ویزے کی مدت ختم ہونے سے دو روز پہلے ہوئی تھی۔'' عبدالقادر نے وضاحت پیش کی۔

''اس کے علاوہ لکھبیر سنگھ کے ویزے پر لکھا ہے کہ وہ پاکستانی حدود میں پیدل چل کر جائے گا اور واپسی پر بھی پیدل (on foot) ہندوستانی سرزمین میں داخل ہوگا۔'' کے ایل شرما نے دوسرا اعتراض پیش کیا۔

''آپ خود سرحدی لکیر پر تشریف لائیں، اس وقت تابوت کے اندر لکھبیر سنگھ کے پاؤں ہندوستانی سرزمین پر ہی ہیں۔'' عبدالقادر نے دلیل پیش کی۔

''اُس کے پاؤں تابوت کے اندر ہیں۔ میں قانون کا پابند ہوں اور لکھبیر سنگھ کے پاسپورٹ پر ''on foot'' واپسی کا لفظ درج ہے لہٰذا وہ زندہ ہے یا مردہ، اُس کو ہندوستان داخلے کے لئے ہندوستانی زمین پر پاؤں رکھنا پڑیں گے۔'' کے ایل شرما نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''یہ ایک انسانی مسئلہ ہے اور اس کو قانون سے زیادہ انسانیت کے تناظر میں دیکھا جائے۔'' عبدالقادر نے تجویز پیش کی۔

''یہ ایک قانونی مسئلہ ہے اور میں اس کو قانون کی نظر سے دیکھ رہا ہوں۔'' کے ایل شرما نے جواب دیا۔

''بعض دفعہ کسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے قانون میں نرمی پیدا کی جاتی ہے تاکہ انسانی جذبات کا خون نہ ہو۔'' عبدالقادر نے مشورہ دیا۔

''قانون کی دیوی نے آنکھوں پر پٹی باندھی ہوتی ہے، وہ صرف قانون کو جانتی ہے، اُس کے نزدیک انسانی جذبے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کئے جا سکتے۔'' کے ایل شرما نے کہا۔

منجیت سنگھ اور ہردیپ سنگھ سرحدی لکیر سے فاصلے پر کھڑے انتظار کے عذاب سے گزر رہے تھے۔ اُن کو علم نہیں تھا کہ تاخیر کی اصل کہانی کیا تھی۔ بالآخر پاکستان رینجرز کے دو چاک و چوبند جوانوں نے لکھبیر سنگھ کی لاش کو تابوت سے باہر نکال کر اپنے کندھوں کا سہارا دے کے سرحدی لکیر پر کھڑے ہوگئے اور لکھبیر سنگھ کے پاؤں ہندوستانی زمین پر لگا دیئے۔ بے جان پیادہ ہندوستانی دھرتی پر پاؤں رکھے کھڑا تھا۔ لکھبیر سنگھ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آیا تھا، اب دو پاکستانی جوان اُس کی بیساکھیاں بنے کھڑے تھے۔ لکھبیر سنگھ کے بیٹے اپنے باپ کی لاش دیکھ کر بھاگتے ہوئے سرحد پر آئے اور روتے ہوئے اپنے باپو کی لاش کو گلے لگالیا۔ پاکستان رینجرز کے اہلکاروں نے خالی تابوت ہندوستانی سرزمین پر دھکیل دیا۔

افسانہ

قسمت کا پھیر

سعدیہ بتول/ اسلام آباد۔

بے حد جائیداد اور پیسے کی بہتات بھی ایک طرح کا ناگ ہے، آستین کا سانپ جو انجانے میں ایسا ڈستا ہے کہ ذہریلا اثر تا حیات انسان کے وجود کو نیلا کیے رکھتا ہے۔۔روشن علی خان آج اسی ذہر کے زیر اثر کمرے کا بلب بجھائے اپنے بیڈ پر نیم دراز تھے ۔لیپ کی دھندلی روشنی میں بھی ان کے چہرے کا تفکر اور اضطراب نمایاں تھا۔رات کی خاموش تاریکی میں وہ آنکھیں موندے اپنی زندگی کے سود و زیاں کا تخمینہ لگا رہے تھے۔۔ماہ و سال کا حساب کر رہے تھے۔آج نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے تو زندگی ہی سو کر گزار دی ہو۔ہاں آج ہی تو جاگے تھے، آج ہی تو انہیں معلوم ہوا تھا کہ پاؤں تلے سے زمین کیسے سرکتی ہے۔کل تک سب کچھ معمول کے مطابق تھا وہ اپنے جاہ و جلال سمیت بارعب روشن علی خان تھے لیکن آج۔۔۔۔اور پھر وہ صبح کا واقعہ۔۔۔۔وہ سوٹڈ بوٹڈ شخص۔۔۔۔وہ پروقار آفس اور وہ با عزت عہدے پر متمکن شخص۔۔۔انہیں اپنا آپ پھر سے کمتر لگنے لگا۔اپنی کم مائیگی کا احساس انہیں کچوکے لگا رہا تھا۔ان کی تمام عمر اپنی برتری کے زعم میں گزری تھی وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ قسمت کا پھیر انہیں اتنی بلندی پر لے جا کر زمین پر پٹخے گا۔انہیں پڑھنے لکھنے سے کبھی بھی دلچسپی نہ رہی تھی۔ان کے دوست احباب کہتے کہ یار روشن تجھے اتنی محنت کرنے اور پڑھنے لکھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے،علاقے میں کوٹھی تیری سب سے شاندار ہے،لمبی گاڑی اور باوردی شوفر کے ساتھ تو گھومتا ہے،ہر نعمت اور آسائش تجھے میسر ہے یہ پڑھنا لکھنا تو ہم جیسوں کیلئے ہے کہ اس کی بدولت کوئی اچھی ملازمت ہی مل جائے،زندگی کی گاڑی کھینچنے کو کوئی آمدن کا ذریعہ ہی بن جائے۔۔یہ باتیں سن کر روشن علی کا سینہ فخر سے تن جاتا اور ابا جی کی پڑھائی میں دل لگانے والی نصیحتیں ذہن سے پھسل جاتیں۔جیسے تیسے کر کے چھٹی جماعت تک پہنچے اور پھر اسکول کا منہ نہ دیکھا۔ابا جی نے سختی کرنی چاہی تو ماں جی آڑے آ گئیں،کیا کرتے ہیں؟بچہ ہے۔یوں بھی اتنی جائیداد کا اکیلا وارث ہے اسے پڑھ لکھ کر کلرکی تھوڑا ہی کرنی ہے۔ابا جی کڑوا گھونٹ بھر کر چپ ہو رہے پر دل میں سوچتے کہ جائیداد سنبھالنے کیلئے بھی تو تعلیم اور عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔اسکول سے چھٹکارا پانے کے بعد تو روشن علی تھے اور ان کے یار دوست سب کی جیسے عید ہو گئی تھی کبھی شکار پہ جانے کے پروگرام بنتے تو کبھی سیر و تفریح کا منصوبہ تیار ہوتا،کبھی اعلیٰ نسل کے جانور جمع کرنے کا شوق عود کر آتا تو کبھی جدید اسلحہ کی تگ و دو ہوتی غرض ہر ایسا شوق پال رکھا تھا جو عیاشی اور آرام طلبی کی پیداوار ہوتا ہے۔ابا جی زندگی بھر کڑھتے رہے لیکن ان کی روک ٹوک کو بوڑھے شخص کی جھک جھک گردان کر ایک کان سے ڈال اور دوسرے سے نکال لیا کرتے۔۔رہ گئیں ماں جی تو وہ تو بیٹے کی خوشی میں خوش تھیں۔۔ہر آئے گئے کے سامنے اس کی عیش و عشرت،گھومنے پھرنے اور ناز نخروں کا فخریہ ذکر کرتیں ۔اگر کوئی اس روش پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو اسے حسد اور بخیلی پر محمول کر کے اس سے ہر تعلق توڑ لیتیں۔ان کے خیال میں ان کا بیٹا تو شہزادہ تھا جسے ہر من مانی کرنے کا حق حاصل تھا۔مختیں کریں اور فکریں پالیں اس کے دشمن یہ کہہ کر ناک سے مکھی اڑا دیا کرتیں۔ویسے بھی گھر تک محدود رہنے کے باعث ان کی سوچ محض گھنے جمع کرنے اور بڑائی کی باتیں کرنے تک محدود تھی پیسے سے جیب بھری ہو اور لٹانے کیلئے خدا نے دل دیا ہو دوستوں کو اور کیا چاہیئے سو جتنے نکمے اور خوشامدی لڑکے تھے روشن علی کے گرد گھیرا ڈالے رکھتے دوستوں کے جھرمٹ میں روشن علی تو خود کو راجہ اندر ہی سمجھنے لگتے۔۔ماں باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی دھڑا دھڑ زمینیں بکنے لگیں،دونوں ہاتھوں سے روپیہ لٹنے لگا،بڑی بڑی دعوتیں منعقد کرتے خوب ہلہ گلہ ہوتا ان سب حرکتوں کا جواز یہ پیش کرتے کہ مجھے خود کو کنجوس کہلوانے سے نفرت ہے۔روپے پیسے کی نمود و نمائش کیلئے اسلحہ بردار محافظوں کے ساتھ سڑک پر نکلتے الغرض وہ ہر اس فن سے واقف تھے کہ جس سے پیسہ اڑ سکے۔اگر نہیں معلوم تھا تو فقط پیسہ کمانے اور بچانے کا ہنر نہیں جانتے تھے۔روشن علی اڑانے لٹانے میں طاق تھے تو ان کے احباب بٹورنے میں یکتا تھے۔ان اطوار کا انجام بالآخر وہی ہوا کہ جو ہوا کرتا ہے۔کچھ پیسہ عیش و نشاط کی نذر ہوا تو کچھ دوستوں نے بطور ناقابل واپسی قرض لے لیا اور انصر نے تو حد ہی کر دی۔انصر کا خیال آتے ہی ان کے ماتھے کی رگیں تن گئیں اور منہ سے ایک آہ نکلی۔وہ تو بچپن کا دوست تھا اکٹھے کھیل کر بڑا ہوا تھا لیکن ایسا مار آستین ثابت ہوا کہ سب کچھ فراموش کر گیا۔جائیداد کے کاغذوں پر جعلی دستخط کر کے زمینوں پر قابض ہو گیا ۔انہیں تو تب معلوم ہوا جب وہ زمین قبضہ ہونے کے بعد آگے بھی دو دفعہ بک چکی تھی،وہ تو ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔ماہوار آمدن کے بند ہو جانے سے قرض چڑھنے لگا۔ان کے پاس اب حویلی بیچ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔اف۔۔۔۔ان کے دل سے ایک ٹیس اٹھی

۔ حویلی جوان کے بڑوں کی عظمت کا نشان تھی ان کی پہچان تھی لیکن اس پہچان کو قائم رکھنا ان کیلئے تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ قرض خواہوں کے تقاضے رفتہ رفتہ دھمکیوں میں بدل رہے تھے سو جی کڑا کر کے حویلی کا سودا کر دیا اور خود شہر میں ایک چھوٹا سا گھر لے کر گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ بچی کچی زمین بیچ کر پیسے بنک میں رکھ لیے تا کہ زندگی کی گاڑی چل سکے۔ مشکل سے سہی لیکن چلو وقت کٹ رہا تھا۔ اس کے بعد روشن علی کبھی پلٹ کر گاؤں نہ گئے۔ یوں بھی گاؤں کے لوگوں کا سامنا کرنے کی اب ان میں ہمت نہ تھی۔ ان لوگوں کے چہروں پر نجانے کیوں تمسخرانہ تاثرات روشن علی کو چڑاتے تھے۔ ان کے دوستوں نے بھی کبھی ان کی خبر نہ لی۔ وہ تو جیسے فصلی بٹیر تھے جو فصل کٹنے کے بعد اڑ گئے ۔ روشن علی کیلئے تنہا عسرت کی زندگی بسر کرنا سوہان روح تھا لیکن کیا کرتے اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ بہن بھائی تو خدا نے نہیں دیے تھے اور رشتہ داروں کو انہوں نے خود بھی کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ انہیں تو بس اپنے احباب کا جمگھٹا، ان کی گپ بازی اور فضول مشاغل میں دلچسپی رہی تھی۔ جب تک اماں ابا زندہ تھے غمی خوشی نباہتے رہے ان کے گزر جانے کے بعد کسی نے روشن علی سے رابطہ نہ رکھا کیونکہ ان کے اکھڑ پن اور بدمزاجی سے سب آگاہ تھے۔ ماں تو بیٹے کی شادی کا ارمان دل میں ہی لیے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اب وہ سوچتے کہ اگر ماں جی کی بات مان لی ہوتی تو اس قدر تنہا تو نہ ہوتا۔ اب تو بس اوپر اللہ کی ذات اور زمین پر ایک رب نواز کا سہارا تھا کہ گزر بسر آرام سے ہو رہی تھی۔ وہ پرانا نمک خوار تھا اس نے مالک کو مصیبت میں تنہا چھوڑنا گوارا نہ کیا اور ساتھ ہی چلا آیا۔ اب وہی ہر طرح کے سرد گرم میں ساتھ نبھا رہا تھا ورنہ وہ سب ساتھی تو نجانے کہاں گم ہو گئے تھے جو بزم نشاط کے عروج پہ پیش پیش رہے تھے۔ جن کی خاطر انہوں نے کبھی اپنے ماں باپ کی نصیحتوں پر بھی کان نہیں دھرا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رب نواز دن رات خدمت کرتا تھا، ہمدرد تھا لیکن آج تو انہیں اس پر بھی سخت غصہ آ رہا تھا۔ بھلا کیوں اس نے انہیں عدالت جانے پر اکسایا تھا۔ نہ وہ کچہری جاتے نہ ان کی اس شخص سے مڈبھیڑ ہوتی اور نہ ان کی یہ جان لیوا کیفیت ہوتی کہ جو اب تھی۔ اف۔۔۔ وقت کتنا ظالم ہے۔

دراصل رب نواز کئی دنوں سے انہیں اس بات پر آمادہ کر رہا تھا کہ وہ کچہری جا کر کسی وکیل سے ملیں اور اپنی قبضہ شدہ زمینوں کی واپسی کیلئے کوئی راہ تلاش کریں۔ وہ خود تو ہمت ہارے بیٹھے تھے لیکن رب نواز کے بہت سمجھانے اور اصرار کرنے پر بالآخر کچہری عبدالغفور صاحب سے ملنے چلے گئے۔ رب نواز کے مطابق وہ شہر کے بہت لائق فائق وکیل تھے اور خداترسی کے سبب زیادہ فیس بھی نہ لیتے تھے۔ روشن علی خان عبدالغفور صاحب کے منشی کے پاس بہت دیر سے بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے کمرے میں اور بھی مختلف طبقات کے لوگ موجود تھے سب کی نگاہیں دروازے پہ ٹکی تھیں کہ دروازہ تیزی سے کھلا اور ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص اندر داخل ہوا ساتھ ایک منشی فائلیں اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے فون کان سے لگائے اور دوسرے ہاتھ کے اشاروں سے منشی کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ لوگوں کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں وکیل صاحب کی آمد پر سب لوگ اپنے مسائل بتانے کیلئے ان کی جانب لپکے۔ لوگوں کے اس ہجوم میں سے کسی نے پیچھے مڑ کر روشن علی خان کو ڈبڈبائی آنکھیں پونچھتے ہوئے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ آہ۔۔۔ بیتا وقت ان کے آنسوؤں میں تیر رہا تھا۔ اسی دھندلاہٹ میں ڈوبے مناظر سے بھری آنکھیں لیے روشن علی اس وقت اپنے کمرے میں نیم دراز تھے۔ رب نواز سو جتن کر چکا تھا کہ وہ کچھ کھا لیں یا کم از کم یہی بتا دیں کہ کچہری میں کیا معاملہ ہوا اور اس خاموشی اور سکوت کا کیا سبب ہے؟ روشن علی خان کے ہونٹوں پہ لگے قفل کی چابی رب نواز کو نہ مل سکی۔ وہ حیران پریشان سا اپنی کوٹھری میں سونے چلا گیا۔ اب روشن علی تھے اور آوازوں کا ایک شور جو ان کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہا اب غفورے بس بھی کر کتنا پڑھے گا۔۔۔؟ یہ سن کر ملک ذوہیر نے ہانک لگائی نہ چھیڑ اسے روشن علی یہ نہیں پڑھے گا تو اور کون پڑھے گا۔ ہاں ہاں وڈا افسر تو اسے ہی بننا ہے نا۔۔۔ ہہہ۔ غفورا مائی بھاگاں کا بیٹا تھا جو روشن علی کے ہاں برتن دھوتی تھی۔ غفور بچپن سے ہی کتابی کیڑا تھا۔ پڑھائی میں بھی نمایاں رہتا۔ روشن علی دوستوں کے ساتھ مل کر اکثر اس کا مذاق اڑاتا لیکن وہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔ انہیں یاد آیا کہ جس سال وہ فیل ہوئے تھے اس سال غفور کی اول پوزیشن آئی تھی لیکن اس وقت انہوں نے اس بات پر دھیان ہی نہ دیا تھا نہ ہی کسی کے اول یا دوم آنے سے تب انہیں کوئی فرق پڑتا تھا۔ یہ فرق تو آج پڑا تھا جو کسی صورت دور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس وقت تو بس پڑھائی سے جان چھڑانے کی دھن سوار تھی اور آج کیا انجام ہوا تھا اس کوشش کا۔۔۔ وہ مائی بھاگاں کا بیٹا غفورا جسے کبھی انہوں نے اپنے برابر بھی بٹھانا پسند نہ کیا تھا عبدالغفور صاحب بن کر معاشرے کا فعال رکن بن چکا تھا۔ لوگ اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے اور وہ۔۔۔ سی۔۔۔ ان کے دل میں جیسے ایک کانٹا سا چبھا تھا۔

جعفر حسن مبارک/فیصل آباد

محبت نے جو مر جانے کی دی ہے
ہمیں ایسی رعایت کون دے گا

سوادِ حزن میں رہنے کا حوصلہ کریں گے
شکستِ ذات کو ہم اپنا حاشیہ کریں گے
ہم اک خیال کو دے دیں گے داستاں کا مزاج
ہم ایک خواب کو خوابوں کا سلسلہ کریں گے
چلیں گے جس بھی کسی پر بھی، یقیں رکھنا
تمہاری سمت روانہ وہ راستہ کریں گے
نہیں ہے ہم کو یہ درکار، محفل آرائی
کوئی کرے سو کرے ہم تو تخلیہ کریں گے
بٹھا کے سامنے ماضی دکھائیں گے اس کو
ہم اس کے سامنے یادوں کا آئنہ کریں گے
نہ دے گا ساتھ اگر وہ بھی تو تن تنہا
ہم اپنے آپ کو ہی اپنا قافلہ کریں گے
کیا ہے وعدہ جو جعفر حسن مبارک سے
کریں گے پورا اُسے اور شرطیہ کریں گے

برسرِ خاک بلاتا ہے مجھے
دشتِ ادراک بلاتا ہے مجھے
میں بلاتا تھا اُسے لیکن اب
دامنِ چاک بلاتا ہے مجھے
چشمِ غم پہ پڑا مدت سے
کارِ نمناک بلاتا ہے مجھے
کاٹ دینے کے لیے پر میرے
طورِ افلاک بلاتا ہے مجھے
میں کماں کی نہیں سن پاؤں گا
میرا فتراک بلاتا ہے مجھے

جھیل کے وسط میں یوں لگتا ہے
ماہِ بے باک بلاتا ہے مجھے
ڈوبتا جاتا ہوا دریا میں
ایک پیراک بلاتا ہے مجھے

زرِ حسن لطافت کو دے گا
مری غزلوں کو، نسبت کون دے گا
محبت نے جو مر جانے کی دی ہے
ہمیں ایسی رعایت کون دے گا
عیاں ہے گو تمہاری بے گناہی
مگر اس کی وضاحت کون دے گا
وصالِ یار تیرے بعد مجھ کو
بتا ایسی اذیت کون دے گا
ہوا کرتی ہے اچھے وقت کی جو
ہمیں ایسی بشارت کون دے گا
نہ ہوگا وہ اگر محوِ تکلم
تو لفظوں کو حلاوت کون دے گا
جو صرفِ کار ہیں سینے میں جعفر
اُن آہوں کو فراغت کون دے گا

دشت میں بری گھٹاؤں کا صلہ کیا نکلا
سوچتا ہوں کہ وفاؤں کا صلہ کیا نکلا
جس کر آج بھی قائم ہے ہمیشہ کی طرح
تو بتاؤ کہ ہواؤں کا صلہ کیا نکلا
کسی منزل پہ پہنچ پائے نہ ہم لوگ کبھی
ہائے ہم آبلہ پاؤں کا صلہ کیا نکلا
دیکھ کر بہتا لہو روز، سوال اُٹھتا ہے
امن کی نیک دعاؤں کا صلہ کیا نکلا
قہرِ آلام میں اے میری محبت کے شجر
سوچتا ہوں تری چھاؤں کا صلہ کیا نکلا
کھا گئی جن کی جوانی کو بلا نشے کی
اُن جواں بیٹوں کی ماؤں کا صلہ کیا نکلا
اس نے دیکھا نہ پلٹ کر تری جانب جعفر
دی گئی تیری صداؤں کا صلہ کیا نکلا

حالاتِ دلِ فگار کی صورت بدل گئی
وہ کیا بدل گیا مری قسمت بدل گئی
کم ہو گیا ہے ملنے ملانے کا سلسلہ
لگتا ہے دوستوں کی ضرورت بدل گئی
اب ہو گئے ہیں لوگ مفادات کے اسیر
ہوتی تھی دل کو دل سے جو نسبت بدل گئی
اس دشت نے تو مجھ کو نئے ولولے دیے
اس ہجر میں تو میری طبیعت بدل گئی
کلیاں مہکنے لگ گئیں طائر چہک اُٹھے
آنے سے تیرے باغ کی حالت بدل گئی
اب دیکھئے تو لگتا ہے چند ایک سال میں
اقدار کی ہر ایک روایت بدل گئی
اب تک جو سازگار ہے جعفر ترے لیے
تب ہوگا کیا جو وقت کی نیت بدل گئی

عمران مفتی/میانوالی

کسی کے ساتھ میں کھلتا نہیں ہوں
مری پہچان ہے بھی اور نہیں بھی

سفر آسان ہے بھی اور نہیں بھی
بدن سامان ہے بھی اور نہیں بھی
میں اک ایسی کہانی ہوں کہ جس کا
کوئی عنوان ہے بھی اور نہیں بھی
چھپائے عشق تو چھپتا نہیں ہے
علی الاعلان ہے بھی اور نہیں بھی
زمیں پر دیکھ کر مجھ کو ابھی تک
فلک حیران ہے اور نہیں بھی
اگر یہ زندگی ہے موت اس کا
کوئی تاوان ہے بھی اور نہیں بھی
میں پہلی بار آیا ہوں جہاں میں
جگہ انجان ہے بھی اور نہیں بھی
خود اپنے ہونے پر عمرانؔ مفتی
مرا ایمان ہے بھی اور نہیں بھی

کسی پر مان ہے بھی اور نہیں بھی
یہ دل نادان ہے بھی اور نہیں بھی
کھڑا ہوں ایک دوراہے پہ اب تو
کوئی ارمان ہے بھی اور نہیں بھی
مقابل آپ اپنے آگیا ہوں
مرا میدان ہے بھی اور نہیں بھی
میاں یہ عشق ہے اس میں ملن کا
کوئی امکان ہے بھی اور نہیں بھی
میاں والی کا اب عمرانؔ مجھ میں
کہیں اک خان ہے بھی اور نہیں بھی

کہیں پر دھیان ہے بھی اور نہیں بھی
در امکان ہے بھی اور نہیں بھی
یہاں ہے خود فراموشی یہاں پر
کوئی پیمان ہے بھی اور نہیں بھی
کسی کے ساتھ میں کھلتا نہیں ہوں
مری پہچان ہے بھی اور نہیں بھی
اگر دیکھوں صفات اب اُلفت
خطا آسان ہے بھی اور نہیں بھی
میں اک تنکا ہوا کے دوش پر ہوں
بدن ہلکان ہے بھی اور نہیں بھی
وہی گاؤں مگر پیپل کہاں ہیں
یہ وہ پیلان ہے بھی اور نہیں بھی

نظر شمشیر ہے بھی اور نہیں بھی
کہ مثل تیر ہے بھی اور نہیں بھی
محبت جرم ہے ایسا کہ جس کی
کوئی تعزیر ہے بھی اور نہیں بھی
خطا تھی پر تری منشا یہی تھی
مری تقصیر ہے بھی اور نہیں بھی
عطا ہے اور عطائے بے بہا ہے
سخن جاگیر ہے بھی اور نہیں بھی
سخن کے شہر میں تھوڑی بہت اب
مری تشہیر ہے بھی اور نہیں بھی
فضا میں غیب سے عمرانؔ آئے
مری تحریر ہے بھی اور نہیں بھی

یہ دل دلگیر ہے بھی اور نہیں بھی
کہ جھنگ میں ہیر ہے بھی اور نہیں بھی
خود اپنے ہاتھ پر بیعت ہوا ہوں
سو میرا پیر ہے بھی اور نہیں بھی
ہیں میری شاعری میں دین و دنیا
سو پرتاثیر ہے بھی اور نہیں بھی
خود اپنی مرضی سے ہوں قید اس کا
کوئی زنجیر ہے بھی اور نہیں بھی
محبت درد ہے ایسا کہ جس میں
ملن اکسیر ہے بھی اور نہیں بھی
صفِ یاراں میں دشمن گھس گیا ہے
کماں میں تیر ہے بھی اور نہیں بھی

ذرا مشہور ہے بھی اور نہیں بھی
وہ کچھ مغرور ہے بھی اور نہیں بھی
خدا سے بات کا اک وہم سا ہے
مرا دل طور ہے بھی اور نہیں بھی
خیالوں میں بدن گھوما ہے دنیا
تھکن سے چور ہے بھی اور نہیں بھی
نوید موسم گل بھی خزاں بھی
شجر مسرور ہے بھی اور نہیں بھی
تجھے دیکھا مگر بجلی نہیں ہے
نگہ مخمور ہے بھی اور نہیں بھی
میاں یہ کوچۂ اُلفت ہے اس کا
کوئی دستور ہے بھی اور نہیں بھی

زاہد محمود شمس/لاہور

پروین شاکر کی یاد میں طویل نظم سے......

پھول قرطاس پہ وہ سجاتی رہی
وہ تو لفظوں سے منظر بناتی رہی
آئینہ نفرتوں کو دکھاتی رہی
سب کو انداز اُلفت سکھاتی رہی
بن کے مینا کہیں گنگناتی رہی
بن کے تتلی کہیں لہلہاتی رہی
اپنی ہمت کو وہ آزماتی رہی
دل کے شیشے کے ٹکڑے ملاتی رہی
دکھ کے دامن سے کانٹے چھڑاتی رہی
سکھ کی زنجیر برسوں ہلاتی رہی
وقت کی رو میں خود کو بہاتی رہی
پھول ہر سمت لیکن لٹاتی رہی
سب اناؤں کے مندر گراتی رہی
جانے والوں کو خود ہی بلاتی رہی
جس قدر اپنے دکھ کو دباتی رہی
اُس قدر دکھ میں وہ ٹمٹماتی رہی
تھے خزانے جہاں کے بہت سامنے
ہاتھ پھولوں کی جانب بڑھاتی رہی
پیار کی راہبر پیار کے نام پہ
دم بہ دم اپنے سر کو جھکاتی رہی
سبز چشموں سے سیراب کر کے سخن
امن اور پیار کے پھول اُگاتی رہی
بن کے ہر دم بہاروں کی نورِ نظر
دھوم پت جھڑ میں بھی وہ مچاتی رہی
ساحرانہ لب و لہجہ اپنا کے وہ
دل میں رہنے کا اعزاز پاتی رہی
جیسے پھولوں کی ہو شاہزادی کوئی
پنکھڑی سے وہ خوشبو اُڑاتی رہی
راہِ اُلفت کو منزل سمجھتی تھی وہ
راہِ اُلفت میں پلکیں بچھاتی رہی
اُس سے زیادہ لبوں پہ سجائی ہنسی
دل پہ جتنے بھی وہ زخم کھاتی رہی
لعل و گوہر سے ارزاں ہے انساں کا دل
قدر دل کی ہمیشہ بڑھاتی رہی

اپنی معصومیت کے وہ پاکیزہ رنگ
ہر نگارش پہ دل سے چڑھاتی رہی
درسِ انسانیت کر کے روشن سدا
یاد پیغمبروں کی دلاتی رہی
اپنے ہاتھوں سے خود پونچھ کر اپنے اشک
اپنے سینے سے خود کو لگاتی رہی
تتلیوں، چاند تاروں سے بہلا کے من
اپنی تنہائیوں کو مناتی رہی
عمر بھر روز و شب کو بہ کو، دم بہ دم
راہِ اُلفت میں پلکیں بچھاتی رہی
کب وہ اپنے لیے وہ تو سب کے لیے
سب کی محفل میں ہر حال جاتی رہی
ایسا لگتا ہے اس کو مہکتے حروف
خوشبو باغوں سے چن کر تھماتی رہی
بن کے چڑیا ادب کے حسیں باغ میں
وہ تو چاروں طرف چہچہاتی رہی
لفظ ہی خاص یاور تھے اُس کے یہاں
سنگ لفظوں کے جیون بتاتی رہی
رنج و غم کے بھنور رہ میں آئے بہت
ہر قدم پہ قدم وہ جماتی رہی
وقت کی روح فرسا کڑی دھوپ میں
خود کو لفظوں کو تھامے بھگاتی رہی
پیکرِ عزم و ہمت تھی وہ صاحبو
کیسے کہہ دوں کہ وہ لڑکھڑاتی رہی
اُس کے الفاظ کے طائروں کی اُڑان
اُس کے دکھ سکھ ہمیں بھی سناتی رہی
دامنِ صبر سے اشک سب پونچھ کر
خود کو لوری سنا کے سلاتی رہی
اپنے ہر درد کا بوجھ اُٹھاتے ہوئے
اپنے شانوں کو خود تھپتھپاتی رہی
اوج یہ ہی تو ہے اُس کے افکار کی
پتھروں کے دلوں کو کھلاتی رہی
لب جو کھلتے تو ہر سو بکھرتی مہک
لفظ دل کے چمن سے وہ لاتی رہی
جس نے دیکھا ہے اس کو وہ شاہد بھی ہے
آندھیوں میں دیے وہ جلاتی رہی

بس محبت، محبت، محبت تھی وہ
لفظ نفرت بھی ہم کو بھلاتی رہی
جتنے راہوں میں کوہِ ستم آئے تھے
اپنے لفظوں سے ان کو ہٹاتی رہی
جو ہر اک موڑ پہ مجھ کو نازاں کرے
یہ محبت ہے سب کو بتاتی رہی
ساتھ جب تک تھا ممکن جیبوں کا وہ
سانس کی ڈور تھامے نبھاتی رہی
غم کی ہر میں پہ اُس نے مسکا دیا
غم کو خوشیوں کے پیچھے چھپاتی رہی
کر کے شمشیر اپنا قلم ہر گھڑی
ظلم کے سامنے سر اُٹھاتی رہی
آس آنکھوں میں ساحل کی مرنے نہ دی
تو نے دل سے بھی کشتی چلاتی رہی
تم کو پروین کتنوں نے دیکھا نہیں
پھر بھی تم ان کے دل میں سماتی رہی
دل ترا تذکرہ چھیڑ بیٹھا تو تھا
دیر تک یاد تیری رُلاتی رہی
میں ترے جو تصور میں لکھتا رہا
سوچ میری مہک میں نہاتی رہی
تیرے لفظوں سے اُٹھتی مہک دیکھ کر
دور نفرت کھڑی کپکپاتی رہی
تیرے جانے کی ظالم خبر دیر تک
ذہن و دل میں کھڑی سنسناتی رہی
روک پائی نہ تتلی تجھے جانے سے
پاس آ کر ترے پھڑپھڑاتی رہی
تیری خوشبو حزیں ہے ترے بعد اب
تیرے ہوتے ہوئے دندناتی رہی
لفظ پروین تیرے سبھی ہیں امر
ان کو خونِ جگر تو پلاتی رہی
تجھ پہ نازاں ہے یہ آسمانِ ادب
تو جہاں مثلِ مہ جگمگاتی رہی
میں اُسے دیکھ کر شمس لکھتا رہا
وہ مرے سامنے جھلملاتی رہی

ڈاکٹر وقار خان

یہ کڑھتے رہنا کچھ آسان تو نہیں صاحب
مجھے بھی دیکھ کہ میں دوسروں کے غم میں مرا

ستم پسند بھی کوئی کسی ستم میں مرا
یا کوئی ڈھیٹ بھلا ایسے ایک دم میں مرا
یہ کڑھتے رہنا کچھ آسان تو نہیں صاحب
مجھے بھی دیکھ کہ میں دوسروں کے غم میں مرا
وجود اپنی ہی مرضی کا جب نہیں پایا
عدم میں جیتا رہا اور پھر عدم میں مرا
جب اعتماد نہیں تھا بہت سکون میں تھا
میں خود فریب تو بس اپنے ہی بھرم میں مرا
مرے تو پیار میں بھی مبتلا ہوا تھا خدا
میں بدنصیب کہ میں خواہشِ صنم میں مرا
وہ پہلا ہاتھ کہ جس نے لکھی تھی پہلی کتھا
یہ پہلی بار تھا کوئی کسی جنم میں مرا
میں جنگ جیتنے کی ٹھان کر نہیں آیا
وقارؔ کافی ہے میں سایۂ علم میں مرا

زیادہ سوچنے والے تجھے پتہ نہیں ہے
جو تجھ کو سچ لگتا ہے وہ ترا نہیں ہے
وہاں پہ ہم بھی ہیں موجود، ڈھونڈنے والی
سو تیرے دل میں اکیلا ترا خدا نہیں ہے
تمہیں پتہ ہے کہ تم کس لیے ہوئے ہو ذلیل
تمہارے پاس کوئی اپنا نظریہ نہیں ہے
میں بددماغ مرے سارے دوست میری طرح
کوئی بھی دنیا کے بارے میں سوچتا نہیں ہے
اے لڑکی! تجھ کو بھلا مجھ میں کیا نظر آیا
وقارؔ خام صفت تیرے کام کا نہیں ہے

خطا قبول نہیں ہے تو خود خطا کر دیکھ
یا ایک بار برابر میں میرے آ کر دیکھ
یہ میرا صبر ہے، یہ مجھ پسے ہوئے کا صبر
خدائے قہر! تو آ قہر آزما کر دیکھ
غرور وار دیا میں نے فِی سَبِیلِ الْعِشْق
اے عشق تو بھی تو اب تھوڑا حوصلہ کر دیکھ
میں دل کا اچھا ہوں لیکن ذرا سا ہوں گستاخ
تو ایک بار مجھے سینے سے لگا کر دیکھ
تو آزما تو چکا ہے یہ سارے مکر و فریب
بس اب اذانِ محبت زباں پہ لا کر دیکھ
وہ کچھ بتانے سے شاید جھجکتی ہوگی وقارؔ
بس ایک بار اُسے نام سے بلا کر دیکھ

میرے ہونٹوں کا ابھی زہر ترے جسم میں ہے
تو اگر بچھڑا تو کیا چین سے رہ پائے گا؟
اے سخن فہم! مرے شعر سے کیا لگتا ہے؟
کیا مرے بعد مجھے یاد رکھا جائے گا؟
میں تو اس شوق میں ہوتا ہوں کہ کچھ بولیں لوگ
بولنا اپنا کبھی رنگ تو دکھلائے گا
تو جو اب ساتھ نہیں ہے تو یہی لگتا ہے
اب خدا بھی تو مرے کام نہیں آئے گا
جو بھی کہنا ہے یہاں جھوٹ کے انداز میں کہہ
سچ اگر تو نے کبھی بولا تو پچھتائے گا

چوٹ دشمن پہ بھی پڑتی ہے تو رو پڑتے ہیں
خاک لڑ پائیں گے احساس کے مارے ہوئے لوگ
کسی گمنام سے دربار پہ جا بیٹھیں گے
تیری دنیا سے بھی تھک ہار کے ہارے ہوئے لوگ
اب تو مجبور ہیں جو نام ملے رکھ لیں گے
ہاں مگر عرشِ معلیٰ سے اتارے ہوئے لوگ
ہم پہ تم جبر کرو گے تو کرو گے کیا جبر
ہم تو ہیں عشق کی راہوں سے گزارے ہوئے لوگ

دیکھ پگلی نہ دل لگا مرے ساتھ
اتنی اچھی نہیں وفا مرے ساتھ
یار، جو مجھ پہ جان وارتے تھے
کیا کوئی واقعی مرا، مرے ساتھ؟
میں تو کمزور تھا میں کیا لڑتا
وہ مگر پھر بھی لڑ پڑا مرے ساتھ
میں پریشان تو نہیں مرے دوست
اتنی ہمدردی مت جتا مرے ساتھ
اے خدا! تو تو جانتا تھا مجھے
تو نے اچھا نہیں کیا مرے ساتھ
اب مرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں
اب نہیں کوئی بولتا مرے ساتھ
کیا خبر تجھ کو اچھے لگ جاتے
تو اگر اس کو دیکھتا مرے ساتھ

سیّدہ رباب حیدر

حمدِ الٰہی

تری بخششوں کے ہجوم نے مری لغزشوں کو چھپا دیا
تری رحمتوں کے وفور نے مجھے صرف تیرا بنا دیا
ترے آستاں سے عطا ہوئیں مجھے کس کمال کی رفعتیں
جو نہی سر کو میں نے اے کبریا تری بارگہ میں جھکا دیا
رہِ زندگی میں قدم قدم تری ذات سے رہا رابطہ
جو کبھی غموں نے گرا دیا اسی آن تو نے اُٹھا دیا
کبھی دل کی بات اے کبریا نہ کہی کسی سے ترے سوا
کیا غم نے جو کبھی مضطرب کبھی درد تجھ کو بتا دیا
نہ مٹا سکے جسے چارہ گر، نہ مرے عزیز نہ اقربا
تری اک نگاہِ کرم نے ہی وہی درد پل میں مٹا دیا
غمِ زندگی مجھے بے سکوں کبھی کر سکے یہ مجال کیا
کہ عطائے ربِ جلیل نے مرا بخت اتنا جگا دیا
تری رحمتوں کی ہے حد کوئی نہ عنایتوں کا شمار ہے
جو طلب کیا ہے رباب نے اُسے تو نے اُس سے سوا دیا

مدحتِ والیؐ دو جہاں

اُنہیؐ کے نام کی بخشش ہے یہ کلام مرا
وگرنہ کیا مری اوقات کیا مقام مرا
مرے لبوں پہ ہو جب مدحِ سرورِؐ داور
کریں ملائکہ کیونکر نہ احترام مرا؟
رہِ حیات میں ٹھوکر مجھے لگے کیسے؟
وہ تھام لیتے ہیں جب ہاتھ گام گام مرا
اُسی میں کرلوں بسر اپنی زندگانی میں
جو ایک پل کو مدینے میں ہو قیام مرا
مرا وجود اگرچہ ہے دور طیبہ سے
یہ دل تو رہتا ہے بطحا میں صبح و شام مرا
کبھی تو آئے بلاوا حضورؐ کا مجھ کو
اسی اُمید پہ ہوتا ہے دن تمام مرا
صبا خدارا درود و سلام لے جاؤ
پئے حضور شہؐ سیدالانام مرا
ادا ہو حقِ ثنائے نبیؐ بھلا کیونکر؟
ہے فکر ناقص و ناچیز، ذہن خام مرا
رباب بڑھ گئی توقیر کس قدر میری
جو مدح خوانوں میں آیا ہے اُن کے نام مرا

علیؑ علیؑ کہنا

کوئی بھی زخم ہو کھانا علیؑ علیؑ کہنا
کسی کو غم نہ بتانا علیؑ علیؑ کہنا
ہوں منکرانِ علیؑ یا کہ عاشقانِ علیؑ
کسی بھی بزم میں جانا علیؑ علیؑ کہنا
کبھی لحد کے اندھیروں سے دل ہو رنجیدہ
تو کوئی خوف نہ کھانا علیؑ علیؑ کہنا
ہر ایک گام مقدر سنورتا جائے گا
کوئی قدم بھی اُٹھانا علیؑ علیؑ کہنا
ستائیں غیر یا اپنوں کے غم رُلائیں تو
کبھی بھی دل نہ جلانا علیؑ علیؑ کہنا
وفا کی راہ میں دل ہو کبھی شکستہ تو
علم کے سائے میں آنا علیؑ علیؑ کہنا
ملے گا دل کو سہارا پھر ایک لمحے میں
جو دل دُکھائے زمانہ علیؑ علیؑ کہنا
نجف کے شاہ کو تعبیر سونپ کر اُس کی
کوئی بھی خواب سجانا علیؑ علیؑ کہنا
ملے گی راحت کون و مکاں انھی کے طفیل
مرادِ دل کی جو پانا علیؑ علیؑ کہنا
درِ علیؑ کے گداؤں کا بس وظیفہ ہے
علیؑ کا نعرہ لگانا علیؑ علیؑ کہنا
ربابؔ دل ہو مرا مضطرب کبھی کیونکر
ہے میرا ورد پرانا علیؑ علیؑ کہنا

منزلتِ مخدومۂ کونین سلام اللہ علیہا

عظمتِ آیۂ تطہیر کا پیکر زہراؑ
ہو بہو شافعِ کونین کا مظہر زہراؑ
جن کی آغوش نے سردارِ جناں پالے ہیں
ہیں وہی شبرؑ و شبیرؑ کی مادر زہراؑ
جن کی بخشش سے دو عالم کا مقدر سنورے
ربِ کونین کی رحمت کا وہ محور زہراؑ
جن کی تعظیم میں سردارِ رُسل اُٹھتے ہیں
کس نے جز آپ کے پایہ یہ مقدر زہراؑ
کس کی تقدیس کی قرآن قسم کھاتا ہے
کس پہ نازل ہوئی تطہیر کی چادر زہراؑ
آپ کے در پہ جو جھک جائیں وہ بن جاتے ہیں
میثمؑ و قنبرؑ و سلمانؑ و ابوذرؑ زہراؑ
سب ملائک سے مقرب ہے جو جبریلِ امیں
وہ تو ہے آپ کی دہلیز کا نوکر زہراؑ
بن گیا روحِ امیں سارے ملائک میں وہی
جھک گئی جس کی جبیں آپ کے در پہ زہراؑ
آپ کے دامنِ اطہر سے میں وابستہ ہوں
کیوں مرا دل ہو بھلا بے کس و مضطر زہراؑ
رُتبہ و جاہ و حشم کی میں طلبگار نہیں
آپ کا ہاتھ رہے بس مرے سر پہ زہراؑ
ڈر نہیں تلخیٔ محشر کا مرے ساتھ ہیں جب
احمدؐ و حیدرؑ و حسنینؑ مطہر زہراؑ
مرثیہ خواں ہے ربابؔ آپ کے شہزادوں کے
مرتبہ کوئی کہاں اس سے ہے بہتر زہراؑ

زندگی تھوڑی بچی ہے، اس لیے زیادہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں: مشکور حسین یاد

بھارت سے ہجرت کے وقت گھر کے 35 افراد میں سے میں اکیلا زندہ بچا، گاندھی گورے چٹے آدمی تھے

نامور شاعر، ادیب، صحافی اور وزیراعظم محمد نواز شریف کے اُستاد کے عامر بن علی اور سید امبر زیدی کی بے لاگ گفتگو

بقیہ انٹرویو: شعرو ادب سے متعلق آدمی تھے اور دادی تو لکھنؤ کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ تھیں۔ چھینکا بیگم کے نام سے لوگ انھیں جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا تعلق لکھنؤ سے بھی بنتا ہے۔ ویسے میرے خاندان کا تعلق ضلع مظفر نگر کے قریب بڈاولی گاؤں سے ہے۔ اس گاؤں کے علاوہ بھی ہمارے پاس تین مزید گاؤں تھے جو نواب نے دیے تھے۔ اچھے خاصے جاگیردار تھے۔

ارژنگ: آپ جاگیردار خاندان سے تھے، پھر لکھنے پڑھنے کو کیریئر بنانے کا خیال کیسے آیا؟

مشکور حسین یاد: میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ ضلع حصار میں واقع ہمارے سکول میں ترانہ پاکستان کے خالق حفیظ جالندھری آئے، انھوں نے مجھ سے غزل سنی اور داد دیتے ہوئے کہا کہ تم تو بہت زوردار شاعر ہو۔

ارژنگ: پہلی کتاب شاعری کی شائع ہوئی تھی یا کہ نثر کی؟

مشکور حسین یاد: پہلی کتاب شاعری کی شائع ہوئی، نثر کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا۔ اب تو ساٹھ سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اب تک غزل کے بارہ مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ نثر میں بہت سارے موضوعات پر لکھا۔ انشائیے پر کافی کام کیا۔ اردو انشائیے کا تو مجھے موجد کہا جاتا ہے۔

ارژنگ: آپ معلم اور ماہر تعلیم بھی ہیں، موجودہ پرائم منسٹر نواز شریف بھی آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ تدریس کا تجربہ کیسا رہا؟

مشکور حسین یاد: ذہین طلباء استاد کو پڑھانا سکھاتے ہیں، گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی تمام زندگی پڑھایا اور یہ میرے لیے ہمیشہ ایک اعزاز کی بات رہی ہے۔ میں نے پچیس سال وہاں پڑھایا مگر کبھی ایک کلاس بھی مس نہیں کی۔ ایک بھی ناغہ نہیں کیا۔ یہ جو آج کل کہتے ہیں کہ شاگرد اُستاد کی عزت نہیں کرتے، یہ بالکل غلط اور فضول بات ہے۔ استاد اپنے فرض کو نبھا کر تو دیکھے، شاگرد اب بھی بہت عزت کرنے والے ہیں۔ ایک دفعہ حفیظ جالندھری اپنی بیگم کے ساتھ میری کلاس آ کر پیچھے بیٹھ گئے اور ضد کرنے لگے کہ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میں کیسے پڑھاتا ہوں۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ آپ پڑھائیں مگر انھوں نے ضد نہ چھوڑی اور مجھے پڑھاتا دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ بعدازاں بہت تعریف بھی کرتے رہے۔

ارژنگ: آپ کی جوانی کے ایام میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا بہت چرچا تھا۔ آپ بھی روشن خیال آدمی ہیں، کیا اس تحریک سے بھی تعلق رہا؟

مشکور حسین یاد: انجمن ترقی پسند مصنفین کے تمام سرکردہ لوگ میرے دوستوں میں شامل تھے۔ مگر کبھی اس تحریک کا باقاعدہ حصہ نہیں بنا۔ سچ بتاؤں تو ہم خود بڑے "پاٹے خان" تھے ان دنوں میں۔

ارژنگ: عشق کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

مشکور حسین یاد: ارے بھائی! جس نے عشق نہیں کیا وہ تو بالکل گدھا ہے۔ ہم نے تو زندگی میں بہت سارے عشق کیے۔ عشق کے بغیر تو انسان مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں تو ہمیشہ ہی عشق کے لیے تیار ہوں۔

ارژنگ: آپ کے گھنے بالوں، چستی اور سدا بہار جوانی کا کیا راز ہے؟

مشکور حسین یاد: میرے ابا گنجے تھے، دادا گنجے، نانا گنجے اور دادی بھی گنجی۔ جوانی کے دنوں میں جب میں بال بناتا تو اماں طنز کرتیں کہ بیٹا یہ چند دن کے مہمان ہیں، پھر نہیں رہیں گے۔ میں کہتا اماں میرے بال ہمیشہ قائم رہیں گے۔ میں نے دیکھا ہے آپ اپنے بارے میں جیسا گمان کرتے ہیں ویسا ہی ہو جاتا ہے۔

ارژنگ: آج کل بھی کچھ لکھ رہے ہیں؟

مشکور حسین یاد: بہت کچھ لکھ رہا ہوں۔ لکھنے والا تو لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر میرے پاس زندگی تھوڑی بچی ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ارژنگ: پارٹیشن کی کیا یادیں ہیں؟

مشکور حسین یاد: میں اپنے 35 اہل خانہ میں سے اکیلا زندہ بچ کر پاکستان پہنچا تھا۔ ضلع حصار سے جب ہم نکلے تو میری ماں، بہن، بھائی، نانا، نانی سب مارے گئے تھے۔ میں ان دنوں حصار میں ایک اخبار "پکار" کا

ایڈیٹر تھا۔ ہمارا گھر اسٹیشن کے پاس تھا۔ بڑا اچھا علاقہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ محفوظ ہے۔ مگر بلوائی وہاں بھی پہنچ گئے۔ جب بلوائی حملہ آور ہوئے تو میں زمین پر گر پڑا تھا، ٹھوکر لگی تھی۔ وہ سمجھے کہ میں مر گیا ہوں، سب اہلِ خانہ کو قتل کرنے کے بعد انھوں نے تسلی کے لیے دوبارہ نیزے اور برچھیاں ماریں۔ اتفاق سے جب انھوں نے میرے نیزہ مارا تو وہ زمین میں جا کر پیوست ہو گیا۔ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے، پھر میں گرتا پڑتا لاہور پہنچ گیا۔

ارژنگ: قیامِ پاکستان سے قبل ادبی منظرنامے پر کون لوگ نمایاں تھے؟

مشکور حسین یاد: بہت سے لوگ تھے۔ مگر مجھے جگر مراد آبادی زیادہ پسند تھے۔ باقی سب سے بھی ذاتی تعلق یوں تھا کہ میں اورینٹل کالج لاہور سے فارسی اور اردو میں ایم فل کیا جہاں یہ سب لوگ آتے جاتے تھے۔

ارژنگ: سنا ہے اشوریا رائے آپ سے بہت متاثر ہیں؟

مشکور حسین یاد: ہاں! بمبئی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ کہنے لگیں باقی سب لوگ مجھے انکھیوں سے دیکھتے ہیں، آپ سیدھا دیکھتے ہیں، پڑھنے لکھنے کی شوقین ہیں، مگر ایشوریا کو چھوڑو بمبئی میں ہی میری ملاقات گاندھی جی سے بھی ہوئی تھی۔ میں سروجنی نائیڈو کے ساتھ تھا، گاندھی جی گورے، چٹے آدمی تھے اور لڑکیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ میں نے سروجنی نائیڈو سے پوچھا کہ اس آتما کو مہاتما بنانے میں لڑکیوں کا کتنا حصہ ہے؟

خالد مسعود

وقفِ آلام زندگانی ہے
زندگی درد کی کہانی ہے
گزرا بچپن بھی ہفت رنگ مگر
زیست کی شام کیا سہانی ہے
کتنا دلکش ترا سراپا ہے
ہر نگہ معجزہ بیانی ہے
بات کی جو بھی شعر میں کی ہے
یہ تخیل کی ترجمانی ہے
چارہ گر بھی اکیلا چھوڑ گئے
آپ کی کتنی مہربانی ہے
خار ہی خارِ عدو کے ہاتھوں میں
میرے پہلو میں شادمانی ہے
ہر بلا زیست کی ہوئی رُخصت
اب فقط مرگِ ناگہانی ہے
ہو گئے ہم تو آپ ہی پسپا
تم نے کب ہار اپنی مانی ہے
تیری نظروں سے پیار کرتے ہیں
خوب کیا اپنی مے فشانی ہے
ولولے تازہ خواہشیں ہیں نئی
میرے جذبوں پہ کیا جوانی ہے
اُس کی خواہش ہمیشہ جیت گئی
ہم نے ہر بار ہار مانی ہے
ہجر کی ہیں حکایتیں ساری
وصل کی ہر یہاں کہانی ہے
خوشبو نیلام، رنگ بکنے لگے
شہر میں کس کی حکمرانی ہے
ہم پرستار ہیں تو بس تیرے
تم سے نسبت بڑی پرانی ہے
تم تکلف کو عشق سمجھے ہو
یہ تمہاری تو بدگمانی ہے
جو کہا تم نے ہی کہا ورنہ
اس طرف صرف بے زبانی ہے
اپنی تو کیا ہے شاعری مسعود
بس محبت کی ہی کہانی ہے

....

خرد کو ہوشیار کر کے دیکھیں گے
تمہارا انتظار کر کے دیکھیں گے
رگِ نفس کو بار کر کے دیکھیں گے
جنوں کو اختیار کر کے دیکھیں گے
ہمیں ستاؤ گے جو چھپ کے پردے میں
تو دل کو بے قرار کر کے دیکھیں گے
یہ سب سے ہو چکا ہے نااُمید دل
خود اس کو غم گسار کر کے دیکھیں گے
تغافل اُس حسیں کا کر کے درکنار
اب اُن لبوں سے پیار کر کے دیکھیں گے
پسند شوخ کو یہ رنگ آئے گا
سخن کو اختیار کر کے دیکھیں گے
گزر گئی حیات وہ نہیں ملا
ہم اور انتظار کر کے دیکھیں گے
نجانے دل کا حال کیا ہو روبرو
دل اس طرح دوچار کر کے دیکھیں گے
کہا، نہیں ہے اعتبار ابھی ہمیں
عنایتیں شمار کر کے دیکھیں گے
کسی کا انتظار جان لیوا ہے
سو وقفِ اضطرار کر کے دیکھیں گے
کہا، تمہیں بھی آ گیا ہے رحم تو
سو ہم بھی اعتبار کر کے دیکھیں گے
وہ شوخ اس طرح سے آئے راہ پر
تغافل اختیار کر کے دیکھیں گے
کہیں وہ بدگماں نہ چھیڑنے سے ہو
کہ شوخی اختیار کر کے دیکھیں گے
خدا کے قرب کے لیے اب ایک بار
یہ حسرتیں شمار کر کے دیکھیں گے

بقیہ انٹرویو: حوالے سے مدد کرتے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میڈیا نے پوری دنیا میں پاکستان کے امیج کو نہایت منفی انداز میں دکھایا ہے جس پر دل افسردہ ہوتا ہے۔

ارژنگ: شاعری کے علاوہ کسی اور صنف میں لکھنے کا خیال کبھی آیا؟

ادریس لاہوری: کبھی کبھی اپنی زندگی سے متعلق یادداشتوں کو قلم بند کرتا رہتا ہوں یہاں زندگی اتنی مصروف ہے کہ اکثر اوقات شاعری کے لیے بھی وقت بڑی مشکل سے نکال پاتا ہوں۔ پھر یہ کہ ادبی ماحول بھی اُس طرح میسر نہیں جس طرح پاکستان میں ہوتا ہے ورنہ شاید اپنے اندر چھپی ہوئی ادبی صلاحیتوں کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا۔

ارژنگ: کیا ناروے کے علاوہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی مشاعرے پڑھنے کا اتفاق ہوا؟

ادریس لاہوری: یورپ کے دیگر ممالک میں بھی مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ دعوت نامے تو آتے ہیں مگر مصروفیت کی وجہ سے کم شریک ہوتا ہوں لیکن کبھی کبھار چلا جاتا ہوں ابھی گزشتہ ماہ سویڈن میں بہت بڑا مشاعرہ ہوا اس کے علاوہ کئی ممالک کے مشاعروں میں شرکت کی تھی اور جنوری میں اسی ماہ مسقط کے عالمی مشاعرے میں مدعو ہوں بس

اللہ تعالیٰ کی ذات کا شکر گزار ہوں کہ اُس نے جو عزت بخشی ہے۔

ارژنگ: ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

ادریس لاہوری: خوشبو تقسیم کریں آپ کا دامن بھی مہکار ہے گا۔

نمونہ کلام:

تمہارے ساتھ بھی خبروں میں رہ چکا ہوں میں
اٹھا کے دیکھ لو ردی ہوا پڑا ہوں میں
ملی ہے فرصت غم بھی ترے وسیلے سے
وگرنہ پیار میں مصروف ہی رہا ہوں میں
کسی طرح تو مسرت بنوں میں اشکوں سے
ترے خیال سے دکھ درد چھانتا ہوں میں
نہ جانے کون سا لمحہ فراق دے جائے
یہ کیسا خوف ہے جس میں کہ جی رہا ہوں میں
وہ ایک حادثہ جس نے ترے قریب کیا
اس ایک بھول کی بھگتا بہت سزا ہوں میں
سنائی دوں گا میں تجھ کو ذرا سا شور تھمے
ہوا کے دوش پہ اک تیرتی صدا ہوں میں
مرا حریف ہے ادریس کے سوا اب کون
سو خود سے ہی دست و گریباں ہو گیا ہوں میں

کچا بندھن

یہ جو تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ
خاموش کیوں رہتے ہو؟
ہر وقت خلا میں کیا ڈھونڈتے ہو؟
کبھی کبھی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھتے ہو
تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارا قرب چاہتا ہوں
نہیں ہرگز نہیں
یہ وہ جنگ ہے جو کچھ عرصے سے
دل اور دماغ کے بیچ ہے
کبھی دل حاوی ہوتا ہے
تو کبھی دماغ جیت جاتا ہے
اب دیکھنا یہ ہے
کہ اور کتنا عرصہ
دل
کچے دھاگے سے بندھے اس
کمزور بندھن کو جوڑے رکھتا ہے؟

نعت

یارب جہاں میں موت نہ میری حرام ہو
وقتِ اجل زباں پہ محمدؐ کا نام ہو
اُس وقت میں حضور کی مدحت میں گم رہوں
دارِ فنا سے جب بھی میرا اختتام ہو
میں اُس کو اپنی صبح سعادت کا نام دوں
دربارِ مصطفےٰ میں اگر میری شام ہو
یارب کرم کا ایسا کوئی معجزہ دکھا
سارے جہاں میں تیرے نبی کا نظام ہو
اذنِ حضوری دیجیے مجھ کو بھی یا حضورؐ
کرنے سلام آپ کو حاضر غلام ہو
اے موت میرے سامنے آتا تو اُس گھڑی
نظروں میں میری جب درِ خیر الانام ہو
رفعت نبیؐ کے عشق میں ایک ایسی نعت لکھ
تیرا بھی اُن کے چاہنے والوں میں نام ہو

رفعت علی علوی / ہری پور ہزارہ

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

دیوان منصور کی تقریب پذیرائی و محفل مشاعرہ

میانوالی سے تعلق رکھنے والے ملک کے نامور شاعر ''نیند کی نوٹ بک'' اور ''دیوان منصور'' کے خالق منصور آفاق کے شعری مجموعے دیوان منصور کی تقریب پذیرائی میاں والی کے خوب صورت ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت ملک کے معروف شاعر شعیب بن عزیز نے کی۔ مہمانانِ گرامی میں ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر اقبال شاہد اور ڈاکٹر اسد مصطفیٰ تھے۔ تلاوت کلام پاک کی سعادت جیو اسلام آباد کے رپورٹر آصف بشیر چودھری نے حاصل کی۔ نظامت کے فرائض نیر علی نے انجام دیے۔

تقریب میں منصور آفاق کی زندگی اور اُن کے شعری فن پر حفیظ اللہ نیازی، رؤف طاہر، صہیب مرغوب اور مظہر برلاس نے اپنے تجزیات پیش کیے۔ آخر میں صاحب صدر شعیب بن عزیز نے اپنے خطبے میں منصور آفاق کی شخصیت اور فن شعر پر سیر حاصل گفتگو کی اور منصور آفاق کے ساتھ اپنی یادداشتیں شیئر کیں۔

تقریب کا دوسرا حصہ محفل مشاعرہ پر مشتمل تھا۔ نظامت کے فرائض ندیم بھابھہ نے انجام دیے۔ صدارت معروف شاعر سعادت سعید نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی شعیب بن عزیز تھے۔ دیگر مہمانوں میں معروف شاعر نذیر قیصر، احمد عطا اللہ اور مرشد سعید ناصر تھے۔ مشاعرے میں ملک بھر سے نامور شعرائے کرام نے حصہ لیا۔ اُن میں مقامی شعرائے کرام کے علاوہ نذیر قیصر، احمد عطاء اللہ اور مرشد سعید ناصر تھے۔ ان میں نذیر قیصر، شعیب بن عزیز، صاحب صدر، سعادت سعید، احمد عطاء اللہ، قمر رضا شہزاد، ندیم بھابھہ، تجمل کلیم، حسن عباسی، اعجاز توکل، اظہر فراغ، عمران عامی، مرشد سعید ناصر، رضوانہ سعید روز، راشدہ ماہین ملک، تجدید قیصر، فقیہہ حیدر، سعد ضیغم، یونس تحسین، انعام کبیر اور راول حسین شامل تھے۔

ادارۂ خیال و فن لاہور کے تحت ایوب صابر کے اعزاز میں تقریب

دمام (سعودی عرب) میں مقیم شاعر محمد ایوب صابر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آنگن میں خوشبو'' نستعلیق لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کی تقریب رونمائی 30 نومبر 2016 کو الحمرا ادبی بیٹھک لاہور میں ادبی تنظیم ''ادارۂ خیال و فن'' کے زیر اہتمام ہوئی۔ صدارت خالد شریف، مہمانانِ خصوصی سعد اللہ شاہ، پروفیسر ناصر بشیر اور حسن عباسی۔ مہمانانِ اعزاز انڈیا سے آئے ہوئے شعرا الیاس انجم (چاند پور، بجنور) اور ندیم راعین (مراد آباد) تھے۔ اسٹیج پر ان سب کا استقبال صدر ادارۂ خیال و فن ممتاز راشد لاہوری نے کیا۔ نظامت اس ادارہ کے سیکرٹری اور معروف کالم نگار کرن وقار نے کی۔ تلاوت قرآن غلام ربانی اور نعت رسول عزیز شیخ نے پیش کی۔ استقبالیہ کلمات اس ادارہ کی نائب صدر اور اردو پنجابی کی معروف شاعرہ پروین وفا ہاشمی نے ادا کیے۔ ایوب صابر کی کتاب پر اظہار خیال کرنے والوں میں ناصر بشیر، سید احمد حسن زیدی، ممتاز راشد لاہوری، صفیہ حیات (فیصل آباد) اور شریف اکیڈمی جرمنی کے نگران ولایت احمد فاروقی شامل تھے۔ ان سب نے ایوب صابر کے افسانوں کی متنوع خوبیاں اُجاگر کیں۔ حسن عباسی نے اپنی نظم ''دوستی'' ایوب صابر کی نذر کی۔ ایوب صابر نے صدر ادارۂ خیال و فن ممتاز راشد لاہوری اور حسن عباسی کا خصوصی شکریہ ادا کیا اور اپنا طویل افسانہ ''بے جان پیادہ'' سنایا جس کا مرکزی کردار لکھبیر سنگھ جالندھر سے لاہور آ کر برسوں بعد ہجرت کے وقت چھوڑے ہوئے مکان کو دیکھتا ہے اور اطمینان سے ابدی نیند سو جاتا ہے۔ حاضرین نے ایوب صابر کو خوب داد دی۔

اس تقریب کا دوسرا دور مشاعرے کا تھا۔ نظامت آفتاب خان نے کی۔ تقریباً 25 شعرا و شاعرات تھے۔ خالد شریف، سعد اللہ شاہ، ممتاز راشد لاہوری، حسن عباسی، الیاس انجم، ندیم راعین اور ایوب صابر کے علاوہ دیگر میں نجمہ خان، اعجاز فیروز اعجاز، افضال عاجز، عالیہ بخاری

ہالہ، صفیہ حیات، طارق چغتائی، انمول گوہر، حسن بانو، شاہین بھٹی، صلاح الدین میاں، احسان اللہ مظہر، اسد علی باقی، عبدالرؤف مختار (شیخوپورہ)، محمد جمیل، ہمایوں پرویز شاہد، پروین وفا ہاشمی، نیازت علی نیاز اور ناظم مشاعرہ آفتاب خان، صدر محفل نے اس تقریب کی کامیابی پر ممتاز راشد لاہوری اور حسن عباسی کو دلی مبارک دی اور ایوب صابر کے فن کو بھی خوب سراہا۔

شریک محفل بعض شعرا و شاعرات بوجوہ کلام نہ سنا سکے۔ ان میں نجیب احمد، نیلما ناہید درانی، ناصر بشیر، فاطمہ غزل، پروفیسر نذر بھنڈر اور ریاض جسٹس شامل تھے۔ نمایاں شرکا تھے سید شفقت شاہ، ڈاکٹر روبینہ صبا، ڈاکٹر پروفیسر محمد افضال بٹ، مفتی امیر علی صابری، گلوکار عنایت عابد، سید احمد شاہ، یامین صدیقی، زیڈ اے طارق، نزاکت علی خان، تبسم ناز (مسلم لیگ ق) صبیحہ سلطانہ، گلوکار اسحاق حیدر، ڈاکٹر گلشن طارق (ڈین گیریژن یونیورسٹی لاہور) اور دیگر کئی۔

ادارۂ خیال و فن لاہور کی تقریب بہ اعزاز صدق لاکھانی

آسٹریلیا سے لاہور آئے ہوئے شاعر صدق لاکھانی کے اعزاز میں یکم نومبر 2016 کو ادارۂ خیال و فن لاہور نے اکادمی ادبیات پاکستان (پنجاب) کے گلبرگ لاہور آفس میں ایک تقریب منعقد کی۔ صدارت کئی شعری مجموعوں کے خالق سرفراز علی حسین نے کی۔ نظامت کے فرائض صدر ''ادارۂ خیال و فن'' ممتاز راشد لاہوری نے ادا کیے۔ تلاوت کا شرف مفتی امیر علی صابری نے حاصل کیا جس کے بعد ڈاکٹر کوثر اقبال نے ترنم سے کلام اقبال پیش کیا۔ استقبالیہ کلمات بزرگ خطیب و ادیب اور کالم نگار خشنا قاضی نے ادا کیے۔ مہمان شاعر صدق لاکھانی کا تعارف سرفراز علی حسین نے پیش کیا اور کہا کہ وہ کراچی کی خواجہ برادری سے تعلق رکھتے ہیں جس کا غالب رجحان تجارت کی طرف ہے۔ اس برادری میں قائداعظم نے سیاست میں عروج پایا اور اب صدق لاکھانی نے شاعری میں مقام حاصل کیا ہے۔ وہ 36 سال شارجہ میں رہے اور اب آسٹریلیا میں رہتے ہیں۔ دوبئی میں قیام کے دوران میں نے شاعری میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ مہمان اعزاز صدق لاکھانی نے اپنے اظہار خیال میں اس تقریب کے انعقاد پر اپنے برسوں پرانے دوست ممتاز راشد لاہوری کا دلی شکریہ ادا کیا اور اپنے ادبی سفر کی روداد بیان کی۔

شعری دور میں کلام سنانے والے شعرا اور شاعرات تھے۔ سرفراز علی حسین، صدق لاکھانی، پروفیسر محمد عباس مرزا، ممتاز راشد لاہوری، حسنین بخاری، زاہدہ جبیں راؤ، صائمہ الماس مسرور، بی اے شاکر، ندا سرگودھوی، میجر (ر) خالد نصر اور محمد جمیل۔

تقریب کے اختتام پر سرفراز علی حسین اور ممتاز راشد لاہوری نے اپنی کتب مہمان اعزاز اور بعض دیگر شرکاء کو پیش کیں۔ نمایاں شرکاء میں آغا ارشد، فرزانہ بیگم، اشتیاق مرزا اور دیگر شامل تھے۔

ادبی تقریب

گزشتہ دنوں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز، آرٹ اینڈ کلچر کے زیر اہتمام ''انٹرنیشنل ڈراما ڈے'' کی مناسبت سے اردو اور پنجابی کے معروف ڈراما نگار اور شاعر ڈاکٹر ایوب ندیم کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب ''گل بات'' کا انعقاد کیا گیا۔ میزبانی کے فرائض ''پلاک'' کی ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر صغرا صدف اور خاقان حیدر غازی نے انجام دیے۔ تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ایوب ندیم نے بتایا کہ انھوں نے ڈراما نگاری کا آغاز ایک سرائیکی ڈرامے ''ولدی'' سے کیا۔ بعدازاں ''ہوک'' اور ''دل دے بوہے'' جیسی معروف ڈرامہ سیریلز کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان میں بہت سے ڈرامے لکھے جو اُن کی زندگی کا اثاثہ ہیں۔ ڈاکٹر ایوب ندیم نے کہا کہ ڈراما زبان اور ثقافت کو اُجاگر کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ لہٰذا حکومت کو چاہیے کہ وہ پی ٹی وی ہوم پر پاکستان کی بھی زبانوں کو وقت دے۔ تاکہ پاکستان کی قومی زبان کے ساتھ ساتھ ہماری علاقائی زبانوں اور تہذیب و ثقافت کو بھی فروغ حاصل ہو۔ اس موقع پر منصور آفاق، حفیظ الرحمان خان، کامران نذیر، افضال عاجز، آفتاب خان، وریا ساہی اور فیصل شہزاد نے بھی ڈاکٹر ایوب ندیم کے حوالے سے گفتگو کی۔ ڈاکٹر صغرا صدف، سعدیہ رانا اور دیگر شرکا نے انھیں گل دستے پیش کیے۔ آخر میں ڈاکٹر ایوب ندیم نے اپنا کلام تحت اللفظ اور سجاد بری نے گا کر پیش کیا۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: نازی نواز (رومانی وسماجی ناول) /مصنف: ممتاز راشد لاہوری/صفحات: 144 / قیمت: 250 روپے/تبصرہ نگار: اقبال راہی

ناشر: خیال و فن پبلشرز، آئیڈیل ہاؤس، 12 ٹیپ روڈ لاہور

ممتاز راشد لاہوری کا ادبی سفر کوئی چار عشروں سے جاری ہے اوران کے زیر تبصرہ ناول ''نازی نواز'' تک اُن کے درجن بھر شعری مجموعے اور اتنی ہی نثری کتب آ چکی ہیں۔ ان کی نثری کتب کے موضوعات میں خاصی رنگا رنگی ہے مثلاً لاہور کے نئے پرانے رنگ، پاکستانی نغمہ نگاران، افسانوی مجموعہ ''دل زدہ''، ادبی مضامین کا مجموعہ، تبصرہ کتب کی دو کتابیں وغیرہ وغیرہ۔ اب پہلی بار ان کا ایک ناول سامنے آیا ہے تو اُن کے تخلیقی میدان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس ناول کا انتساب انھوں نے اپنے تیس سال پرانے دوست اور نامور افسانہ نگار و ناول نگار اور شاعر اسلام عظمی کے نام کیا ہے اوران کے تخلیقی جملوں کی تحسین کی ہے۔ اس ناول کے نمایاں ابواب میں فیس بک دوستی، لندن کی سیر، کلر کہار جھیل پر، کھیوڑہ، مری، گاؤں کا ماحول، مزار سلطان باہوؒ، ملتان، کراچی اور لاہور، فارم ہاؤس میں موسیقی، مہندی کی رسم، مزارات لاہور اور آخری ملاقات شامل ہیں۔

اس ناول کا سب سے اہم پہلو اس کا کہانی پن کا حامل ہونا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار کلر کہار کی نازی اور ملتان کا نواز ہے اوران کی باہمی دوستی عصری شعور کی نیرنگیوں سے مالا مال نظر آتی ہے۔ البتہ نواز کی نسبت نازی کا کردار زیادہ حاوی ہے۔

اس ناول کے بعض حصوں میں ممتاز راشد لاہوری کا نثری اسلوب کمال درجے کا ہے۔ مثلاً فارم ہاؤس میں ہونے والی محفل موسیقی کی منظر نگاری، مہندی کی ایک رسم کی منظر نگاری اور حضوری باغ لاہور کی بارہ دری میں ہونے والی نازی اور نواز کی ملاقات کا احوال۔ ان ابواب میں کہیں جزئیات نگاری کمال کی حدوں کو چھوری ہے تو کہیں مکالمے بڑے باکمال ہیں۔

''نازی نواز'' بلاشبہ ایک کامیاب ناول ہے اوراس ناول کا انجام اتنا غیر متوقع ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے آج تک اتنا منفرد انجام کسی ناول کا نہیں پڑھا۔ اس انجام میں ناول کی ہیروئن نازی نے جس طرح دلیری سے اپنی ہونے والی شادی کے فیصلے کو ایک اہم طبی مسئلے سے جوڑا ہے وہ اس لڑکی کے اس عزم کا اظہار ہے کہ آج کی لڑکیاں زندگی کے اہم ترین مرحلے یعنی اپنی شادی کے مرحلے پر ماضی کی طرح گم سم اور لاتعلق نہیں رہتی بلکہ پورے ہوش وحواس کے ساتھ فیصلہ کرتی ہیں۔

اس ناول ''نازی نواز'' کو پڑھتے ہوئے قاری کی دلچسپی مسلسل قائم رہتی ہے۔ اس ناول کا ایک اور اہم پہلو اس میں پاکستان کی مختلف ثقافتی جھلکیاں بھی ہیں۔ خصوصاً پوٹھوہار کے علاقے کی۔ یہ ناول پیپر بیک جلد کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ بیک ٹائٹل پر ممتاز راشد لاہوری کی ابھی چوبیس شائع شدہ کتب کی فہرست دی گئی ہے جس سے ان کی ہمہ جہت تخلیقی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کامیاب ناول پر ممتاز راشد لاہوری کو دلی مبارک باد

نام کتاب: تیرے روبرو/مصنف: پروفیسر عاشق رحیل/صفحات: 176 / قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: نازاو کاڑوی

ناشر: گلشن ادب پبلی کیشنز، آؤٹ فال روڈ لاہور

کتاب کا نام سرورق تصویر کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ پروفیسر عاشق رحیل کا سفرنامہ حج ہے۔ عاشق رحیل ادبی دنیا کے جانے پہچانے اردو پنجابی کے صاحب طرز ادیب اور شاعر مانے جاتے ہیں۔ ادبی محفلوں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ یہ صرف سفرنامہ ہی نہیں بلکہ راہنمائے حج بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جہاں عاشق رحیل صاحب نے اللہ کے حضور کے وقت اپنی دلی کیفیت قلمبند کی ہے وہاں عربوں کی بود و باش اور اس حج سے قبل قبل حصول تعلیم کے دوران عمرہ مبارک کی سعادت سمیٹتے ہوئے حرمین

شرفیین اور گرد و نواح کو اپنی نظر سے دیکھا تھا اور جو فرق نظر آیا وہ بھی دلچسپ انداز میں تحریر کر کے تحریر کو منفرد و معلومات افزا بنا دیا ہے۔ مجھے امید ہے پڑھنے والوں کو ان کی تحریر و کاوش ضرور متاثر کرے گی۔

نام کتاب: عالمگیر تصوف / مترجم: جشید اقبال / صفحات: 200 / قیمت: 170 روپے / تبصرہ نگار: ادارہ
ناشر: بکس بکس، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

تصوف الفاظ اور تصورات تک محدود نہیں۔ تصوف کسی نظریے کا نام نہیں۔ نہ ہی مخصوص عقائد اور رسومات کے مجموعے کو تصوف کہا جا سکتا ہے۔ تصوف راہ حیات ہے۔ زندگی گزارنے کا خدائی سلیقہ ہے۔ اس کی جڑیں مصر کی قدیم روحانی روایات میں ملتی ہیں لیکن اسلام کا پھول کھلنے کے بعد صوفیائے کرام نے تصوف کو نسل انسانی کے اخلاق و عادات کو مہذب و شائستہ بنانے اور طبعی عیوب کی آلودگی سے پاک کرنے کا عملی ضابطہ حیات بنا دیا۔ اس لیے تصوف پاکیزہ زندگی گزارنے کا جمہوری راستہ ہے۔ تصوف داخلی اور خارجی دنیاؤں کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ زیر نظر کتاب عظیم صوفی حضرت عنایت خان کی روحانی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ حضرت عنایت خان وہ عظیم صوفی بزرگ ہیں جنھوں نے تصوف کی صدیوں پرانی روایت کو گزشتہ صدی کے دوران جدید شکل دی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دنیا بھر کے عظیم مذاہب کو عالمگیر عبادات کے ذریعے شیر و شکر کیا۔ ڈاکٹر ڈلووین کی یہ کتاب حضرت عنایت خان کی تعلیمات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان کی دلی اور روحانی کیفیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ ''عالمگیر تصوف'' انسان کی باطنی دنیا کے پرنور سفر کا نثری رزمیہ ہے جس میں حضرت عنایت خانؒ کی صوفیانہ تعلیمات کے علاوہ تصوف کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ داخلی و خارجی امن اور طمانیت کے متلاشی ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ان اصحاب ذوق کے لیے از حد ضروری ہے۔

نام کتاب: عربی جن دے تارے / مصنف: عقیل شافی / صفحات: 128 / قیمت: 250 روپے / تبصرہ نگار: ناز اوکاڑوی
ناشر: مکتبہ شافی لاہور

شاہد عباسی ہوراں دا پہلا پراگا ''منظر بولن والا اے'' ادبی دنیا وچ سراہیا جائے گا۔ تاں جے شاہد عباسی ہوراں شاعری دیاں ساریاں لوڑاں نے تھوڑاں پوریاں کیتیاں نیں۔ شاہد عباسی ہوراں دی ہر گل بات سانوں سب نوں اپنی ای لگدی اے۔ حمد، نعت تے منقبت حضرت امام حسین علیہ السلام چڑھاوے نیں شاہد عباسی دے۔ باقی پراگاں غزلاں تے چو مصریاں نال چانن کھلاریا اے۔ شاہد عباسی ہوراں پنجابی ریختل توں سامنے رکھدیاں ہویاں اپنی ماں بولی دا پورا حق ادا کردا اے۔ مینوں امید اے پڑھن والیاں نوں وی ضرور پسند آئے گا۔

نام کتاب: اکو چپ ای چنگی اے / شاعر و مصنف: کرم علی کیفی / صفحات: 168 / قیمت: 250 روپے / تبصرہ نگار: ناز اوکاڑوی
ناشر: مکتبہ فجر، بیج پیر روڈ نیو مزنگ، لاہور

کرم علی کیفی ہوریں ادبی دنیا دے سرکڈھویں شاعر مصنف گنے جاندے نیں پچھلے کئی ورھیاں تو لکھ رہے نیں پاک پتن دے واسی ہوندیاں پاکستان دے سب وڈھیاں شہراں وچ پڑھن لئی بلایا جاندا اے۔ ہور تے ہور گوانڈھی دیس ہندوستان وچ وی یاترا ئی جا چکے نیں۔
اس توں پہلوں اردو پنجابی دیاں کتاباں بعنہ تور، من تھارنیؒ، سوچاں دی خوشبو، چانن ای چانن، مدنی ماہی، دودو دو یار دل، گیگ پنجابی دی تے ہن دی کتاب ''اکو چپ چنگی اے'' اونہاں بارے لکھے مضمون تے اپنے ساتھیاں نال بنیاں تصویراں دا مجموعہ اے۔ کیفی ہوراں چھاپ کے ریکارڈ جمع کردا اے۔ تاں جے پرکھ پڑچول کرن والیاں نوں آسانی ہو سکے۔ کالج یونیورسٹی دے پڑھاکیاں دی لوڑ وی پوری ہووے گی۔

نام کتاب: کلام منور رانا/مرتب: ریاض ندیم نیازی/صفحات: 224/قیمت: 500 روپے/تبصرہ نگار: ریاض ندیم نیازی
ناشر: رنگِ ادب پبلی کیشنز، 5 کتاب مارکیٹ، اردو بازار کراچی

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منور رانا اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے شاعری کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں ماں، بہن، بیٹی، مزدور، مفلس و نادار اور مہاجرین کے دکھ شامل ہوتے ہیں۔منور رانا دنیائے اُردو ادب میں وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے ماں کے موضوع پر سب سے زیادہ اشعار کہے ہیں۔ان کی غزلوں کے متعدد اشعار زبان زدِ عام ہیں۔خصوصی طور پر ماں کے اشعار تو اہلِ قلم اپنی تحریروں اور مقررین اپنی تقریروں میں کوٹ کرتے ہیں۔منور رانا کی نظمیں بھی کسی سے کم نہیں۔ ''مہاجر نامہ'' ان کی معرکہ آرا نظم ہے۔کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے منور رانا طنز و مزاح کی طرف بھی آجاتے ہیں۔غالب کے بعد ان کی بہترین نمکین غزل ہے۔ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم نے کلام منور رانا میں ان کی نعت، غزل، نظم، قطعات، ماں کے اشعار اور طویل نظم ''مہاجر نامہ'' شامل کر دی ہیں۔ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی منور رانا کی شاعری کو بے حد پسند کیا جاتا ہے۔یہاں بھی ان کے اس منتخب کلام کو پذیرائی حاصل ہوگی۔

نام کتاب: بے وفا سے بھی پیار ہوتا ہے/شاعر: پرنم الہٰ آبادی/صفحات: 160/قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: عطاء الحق قاسمی
ناشر: ادبستان، لاہور

شاعر تو ہر دور میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود رہے ہیں لیکن پرنم الہٰ آبادی کے حصّہ میں جو شہرت اور عزت آئی وہ شاید ہی کسی اور شاعر کا مقدر بنی ہو۔اُن کا کلام ملک کے نامور قوالوں اور گلوکاروں نے گایا۔پرنم الہٰ آبادی ایک درویش صفت انسان اور سچے عاشقِ رسول تھے۔وہ چاہتے تو اپنی شہرت سے بہت سے دنیاوی فائدے حاصل کر سکتے تھے۔مگر انھوں نے دنیاوی زندگی کی نسبت اُخروی زندگی کو ترجیح دی اور خود کو در نبی کا گدا بنا کر توشۂ آخرت کا سامان کیا۔ ''بے وفا سے بھی پیار ہوتا ہے'' ان کی غزلیات کا دوسرا مجموعہ ہے جسے اُنکی یاد وفا اور جاں نثار شاگرد محمد اقبال پیام نے ان کی ذات کا پرچم بلند کیا ہے۔یہ جذبہ بھی صد لائقِ تحسین ہے۔ورنہ مادی ترقی کے اس دور میں روحانی سلسلوں کو کون یاد رکھتا ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ ربّ العزت پرنم الہٰ آبادی کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے شاگرد اقبال پیام کو دنیا اور آخرت میں اس کا اجر دے۔ (آمین)

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگِ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: 24-j ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

نامہ ہائے احباب

رنگ برنگ ارژنگ گویا حسن عباسی پیارے!

السلام علیکم۔ نومبر 2016 کا ''ارژنگ'' باغ و بہار نظر ہوا۔ اس کی دلبرانہ روایات بدستور ہیں۔ مکالمے، گوشے، مضامین، شعری تحفے اور دلچسپ اثرات اسی طرح ہیں حسب توقع حسب ذائقہ۔ ارژنگ ہم ہر دو ماہ بعد باقاعدگی سے آتا ہے لیکن اس کا انتظار پہلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ میں اپنی زشت غلطی میں عاجز ہوں۔ لکھتا کچھ ہوں شائع کچھ ہوتا ہے۔ کمپوزنگ کے شعبے میں خراب لکھائی کی قدر شائد نہیں۔ احباب کمپوز کرا کے تحریر میں بھیجتے ہیں۔ یہاں بوئی میں نئے عہد کی سہولتیں دستیاب نہیں۔ صرف ایک پوسٹ آفس ہے جو میرے گھر سے فاصلے پر ہے۔ یہی غنیمت سہی مگر ان دنوں بھی اکثر بند رہنے لگا ہے۔ میرے لیے ڈاک کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ آپ جانیں اس تنہائی میں کتابیں، رسالے اور خطوط ہی پر تکیہ ہے۔ اس جنگل میں پتھر سرہانا کر کے سو رہنا بھی بہت ہے۔ تحریر اسد عباس خان کی حوصلہ افزائی سے دل کو بڑھاوے ملتے ہیں۔ ان سے اپنا تعلق خاطر پرانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں آصف ثاقب لفظ سے معجزہ دکھاتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہو شرط یہ ہے کہ لفظ کمپوزنگ سے بدوضع نہ ہو گئے ہوں۔ اب یہی دیکھیے اس ارژنگ میں میری غزل کے تین مصرعے خراب ہو گئے ہیں۔

مطلع کا دوسرا مصرعہ یوں ہے:

ہم صید بھی کیسے ہیں، فریاد نہیں کرتے

پانچویں شعر کا مصرع (دوسرا)

شاخوں سے جدا ہو کر فریاد نہیں کرتے

مقطع کا پہلا مصرع

خط لکھ کے دو یار اپنے، پردیس میں ثاقب کو

ہم پر آپ کی عنایت ہے کہ آپ ''ارژنگ'' بھیجتے ہیں۔ ذوق و شوق کی آبیاری کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں ارژنگ کے مضمرات بھی کبھی نیا رُخ بھی اختیار کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ''ارژنگ'' پر مشاہیر کا بھی حق ہے۔ باقی صدیقی، مختار صدیقی، شکیب جلالی، خلیل رامپوری، عبدالحمید عدم، احمد ظفر اور احسان دانش کے خصوص میں بھی تحریریں اس میں شائع ہوں۔ فیض، ندیم، قتیل کے باب میں مضمون آتے ہی رہتے ہیں۔ حفیظ جالندھری، جوش اور مولانا ظفر علی خاں تو آپ کی نظر میں ضرور ہوں گے۔ ٹائٹل وغیرہ زیب و زینت کے اعتبار سے مدیروں کے حسن و جمال کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ ماشاءاللہ

خیر اندیش

آصف ثاقب/ بوئی ہزارہ

عزیز من عامر بن علی!

خدا کرے آپ مع اہل خانہ خیریت سے ہوں۔ (آمین)

'ارژنگ' باقاعدگی سے مل رہا ہے جو آپ کی محبت کا ثبوت ہے۔

ایک غزل برائے ''ارژنگ'' ارسال خدمت ہے۔

فقط والسلام

نصرت صدیقی/ فیصل آباد

محترم و مکرم جناب حسن عباسی!

سلام مسنون۔ ستمبر کا ارژنگ نظر نواز ہوا۔ آپ کی ادارت میں پرچہ دن بدن ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ دلی مبارک باد!

پرچے میں شامل تقریباً سارے مشمولات نے متاثر کیا۔ بالخصوص مرزا خورشید بیگ میلسوی کے تنقیدی مضمون ''تروینی تیرے نام'' ایک تخلیقی شاہکار نے چونکا دیا۔ اردو شاعری میں آئے دن نئے نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر ظفر اقبال نے تو اس میدان میں نئی نئی جہتیں دکھائی ہیں۔ اس حوالے سے زعیم رشید کی کاوش محل نظر ہے۔ ''تروینی'' کے خالق تو گلزار ہیں جنھوں نے اسے اردو شاعری میں متعارف کرایا۔ اردو شاعری میں در آنے والی اس نئی صنف کو کتنی پذیرائی ملتی ہے۔ یہ بعد کی بات ہے لیکن زعیم رشید نے ''تروینی تیرے نام'' لکھ کر جس جرات رندانہ سے کام لیا وہ واقعی قابل تحسین ہے۔ پرچے میں شامل شاعری، افسانے، مضامین اور دیگر مشمولات قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں اگر مجموعی طور پر پرچے کے بارے میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا

ع جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

ارژنگ کے لیے تازہ نعت رسول بھجوا رہا ہوں۔

آخر میں میرا اور مسعود احمد کا پرخلوص سلام

دعا گو

احمد جلیل/ اوکاڑہ

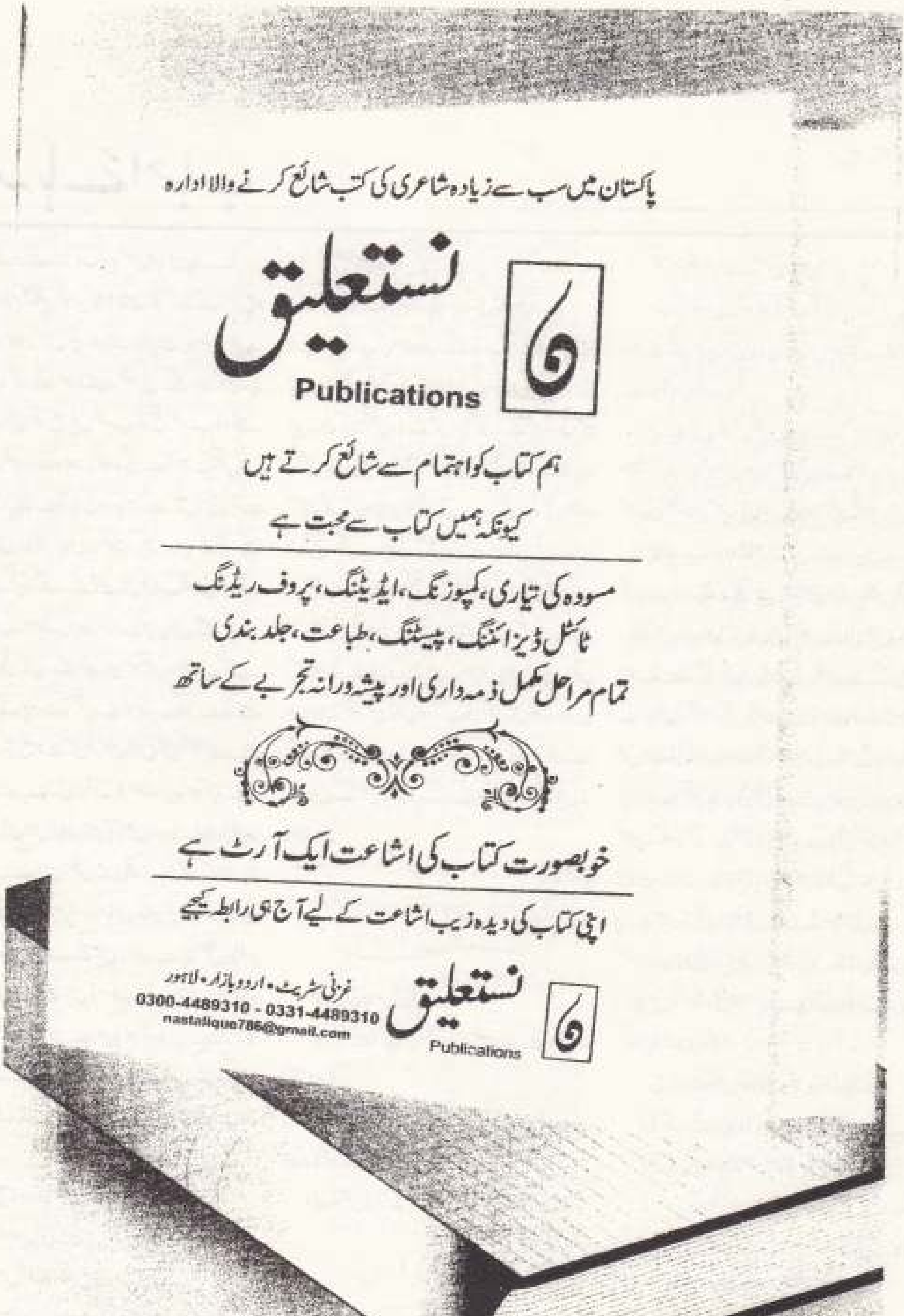
پاکستان میں سب سے زیادہ شاعری کی کتب شائع کرنے والا ادارہ
نستعلیق
Publications
ہم کتاب کو اہتمام سے شائع کرتے ہیں
کیونکہ ہمیں کتاب سے محبت ہے
مسودہ کی تیاری، کمپوزنگ، ایڈیٹنگ، پروف ریڈنگ
ٹائٹل ڈیزائننگ، پیسٹنگ، طباعت، جلد بندی
تمام مراحل مکمل ذمہ داری اور پیشہ ورانہ تجربے کے ساتھ
خوبصورت کتاب کی اشاعت ایک آرٹ ہے
اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے آج ہی رابطہ کیجیے
نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

شاعری مجھے اپنی ذات اور وجود کا حصہ لگتی ہے

پاکستان آ کر یوں لگتا ہے جیسے میں مکمل ہو گیا ہوں

ناروے میں مقیم ممتاز شاعر اور ادبی و ثقافتی تنظیم ''دریچہ'' ناروے کے جنرل سیکرٹری

محمد ادریس لاہوری سے حسن عباسی کی گفتگو

س۔ اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج۔ میں 15 مئی 1959ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول سنت نگر سے، ایف ایس سی اسلامیہ کالج سول لائنز، بی ایس سی، گورنمنٹ کالج لاہور اور انجینئرنگ UET لاہور سے کی۔ یہ تمام عرصہ لاہور کے حوالے سے انتہائی خوب صورت اور دلچسپ یادوں پر مشتمل ہے۔ لاہور شہر سے مجھے بے پناہ محبت ہے اس لیے میں نے اپنے نام کے ساتھ لاہوری لگالیا ہے۔

س۔ شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

ج۔ میرا رجحان بچپن سے ہی شاعری کی طرف تھا طالب علمی کے دور میں بھی بہت سے اشعار زبانی یاد تھے کبھی کبھار مزاحیہ شاعری بھی کر لیتا تھا مگر اس شوق کو باقاعدہ مہمیز اپنے ہمدم دیرینہ علی اصغر عباس کی رفاقت میں نصیب ہوئی اُن کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس باقاعدگی سے جایا کرتا تھا۔ وہاں کے تنقیدی اجلاسوں اور مشاعروں میں شرکت میرے ادبی ذوق کو جلا بخشی اور میں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی اب یہ مجھے اپنی ذات اور وجود کا حصہ لگتی ہے۔

س۔ ناروے کب اور کیسے آنا ہوا؟

ج۔ سفر اور رزق قسمت اور نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ اس بات پر میرا پختہ ایمان اور یقین ہے۔ ناروے بھی ابتداء میں دیگر پاکستانیوں کی طرح بسلسلہ روزگار آیا یہ غالباً 1988ء کا سال تھا۔ غم روزگار سے جب فرصت میسر آئی تو اپنے ہم مزاج لوگوں کی قربت نصیب ہوئی جو کہ خود ادیب تھے جن میں ڈاکٹر ندیم حسین، ضمیر طالب اور بیناجی ہیں۔

س۔ ادبی و ثقافتی تنظیم ''دریچہ'' بنانے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج۔ ناروے میں اردو ادب کو فروغ دینے اور نئی پاکستانی نسل کو اپنے کلچر اور زبان سے آشنا کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے نئی ادبی و ثقافتی تنظیم ''دریچہ'' کی بنیاد 2011ء میں رکھی جس کے صدر ڈاکٹر ندیم حسین نائب صدر ضمیر طالب اور پریس سیکرٹری بیناجی ہیں جبکہ میں اس تنظیم کا جنرل سیکرٹری ہوں۔

لاہور شہر سے بے پناہ محبت کی وجہ سے اپنے نام کے ساتھ لاہوری لگایا

س۔ اب تک آپ اس تنظیم کے تحت کتنے ادبی پروگرام کر چکے ہیں اور ان پروگرامز میں کون کون سے نامور ادیب فن کار شرکت کر چکے ہیں؟

ج۔ ہم نے دریچہ کے پلیٹ فارم سے ان پانچ سالوں میں لگ بھگ بیسیوں پروگرامز کیے اور ان میں مختلف ادیبوں شاعروں اور فن کاروں کی شرکت کی ہے جن میں نمایاں نام انور مسعود، امجد اسلام امجد، صدف مرزا، مخدوم امجد شاہ، ڈاکٹر عارف کسانہ، استاد رفاقت علی خان، استاد اشرف شریف خاں، یونس مہدی اور دیگر مقامی شعراء و فن کار شامل ہیں۔

س۔ پاکستان میں آ کر آپ کے کیا احساسات ہوتے ہیں؟

ج۔ بیرون ملک رہنے والے تمام پاکستانی اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ میں جب بھی پاکستان کے لیے عزم سفر باندھتا ہوں میری خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان جیسا ملک اور محبت کرنے والے لوگ پوری دنیا میں اور کہیں نہیں ہیں۔ یہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت کر کے شاعروں ادیبوں سے مل کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں مکمل ہو گیا ہوں۔ چاہے جتنے دنوں کے لیے آؤں وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ جاتے وقت یہی حسرت دل میں رہ جاتی ہے کہ کاش کچھ دن اور ٹھہر جاتے۔

س۔ پاکستان کے موجودہ حالات پر دل افسردہ تو ہوتا ہوگا؟

ج۔ بیرون ملک رہنے والے پاکستانی اپنے وطن کے حوالے سے کافی جذباتی بھی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو وہ جس ملک میں رہ رہے ہوتے ہیں وہاں کا امن، سکون، خوشحالی اور وہاں کے حکمرانوں کا مثالی طرز زندگی ان کے سامنے ہوتا ہے دوسری طرف جب وہ میڈیا پر اپنے ملک کے حالات دیکھتے ہیں حکمرانوں کے کرتوت سامنے آتے ہیں تو اُن کا دل اس پر بہت کڑھتا ہے۔ لہٰذا جب بھی پاکستان میں کچھ بہتری کے امکانات پیدا ہوتے ہیں تارکین وطن نہ صرف سرمایہ کاری کرتے ہیں بلکہ مشکل وقت میں بھی وہ ہر

بقیہ اندرونی صفحات

اسلم کولسری

ایک تابندہ شاعری کی رخصتی

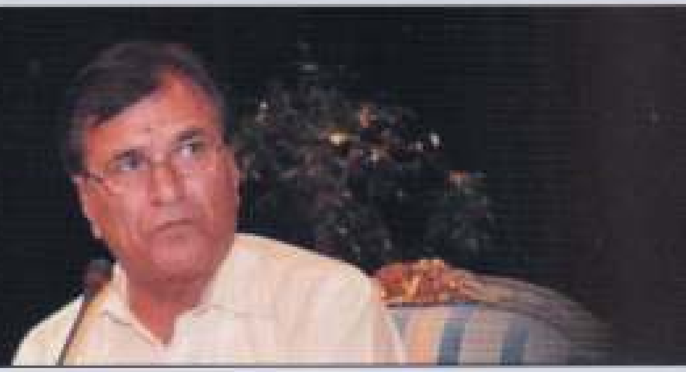

تحریر: عامر بن علی

دس شعری مجموعوں کے خالق شاعر، کہنہ مشق صحافی، خوبصورت مترجم اور بے مثال ادیب۔ اسلم کولسری اب ہم میں نہیں رہے۔ انتہائی دکھ کے ساتھ علمی و ادبی حلقوں میں ان کی طویل علالت کے بعد وفات کی خبر سنی گئی۔ جیسی تابندہ ان کی شاعری تھی ان کی شخصیت بھی ویسی ہی خوبصورت تھی۔ ہم اہل قلم اپنی تحریروں اور شاعری میں جس محبت کا والہانہ اظہار اور پرچار کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ اسی تناسب سے وہ محبت، خلوص اور دیگر اخلاقی خوبیاں ہم اہل حرف کی ذاتی شخصیت کا بھی حصہ ہوں۔ کبھی کبھی مگر ایسے خوبصورت ادیب اور شاعر بھی ادبی منظرنامے پر ظاہر ہوتے ہیں جن کی تحریر بھی لاجواب اور شخصیت بھی باکمال ہوتی ہے۔ جن انسانی خوبیوں کا اظہار اور تقاضا وہ اپنے محبوب اور سماج سے کرتے ہیں، خود بھی ان اخلاقی خوبیوں کا پیکر ہوتے ہیں۔ اپنی ادبی زندگی میں ملنے والے قلم قبیلے کے لوگوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو اسلم کولسری ان مستثنیات میں ایک درخشاں مثال نظر آتے ہیں، جو سراپا محبت تھے۔ سرتاپا محبت میں ڈوبے ہوئے محبتیں بکھیرتے ہوئے۔

یوں تو ان کی پیدائش 1946ء میں اوکاڑہ کے ایک نواحی گاؤں کولسر میں ہوئی تھی۔ مگر ایسے عظیم لوگوں کا سن پیدائش اور وفات کوئی زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہوا کرتا ہے۔ اہم واقعہ اور بنیادی اہمیت ان جیسے درویش صفت فنکاروں کا ہم دنیاداروں کے درمیان میں سے ہو کر گزرنا ہے۔ اسلم کولسری ستر برس اپنی درویشی پر قائم رہتے ہوئے ہم اہل دنیا کو محبت کا سلیقہ اور جینے کا خوبصورت طریقہ اپنی زندگی کی مثال سے سکھاتے گزر گئے۔ ہماری دنیا کی آلائشوں نے انھیں چھوا تک نہیں۔ سخت محنت، جدوجہد اور مشکلوں میں زندگی گزاری مگر ان کی زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ ان کو کوئی غم بھی ہو سکتا ہے۔ ان کی اُجلی مسکراہٹ اصلی تھی۔ بالکل رسمی اور بناوٹی نہیں تھی۔ وفات سے چند روز قبل لاہور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر تیمارداری کے لیے حاضری دی تو وہ چھڑی لے کر بیٹے عمران اسلم کا کاندھا پکڑ کر، بڑی مشکل سے بستر سے اُٹھ کر بیٹھک تک پہنچے۔ ان کی اُجلی مسکراہٹ اور اس کی زندگی و تازگی پر جسمانی نقاہت کا ذرا بھی اثر نہیں تھا۔ وزن انتہائی کم ہو چکا تھا، شیو بڑھی ہوئی تھی لیکن واللہ چہرے سے نور برستا تھا، جو ان کی عمر بھر کی نیکیوں کا ثمر تھا۔

اسلم کولسری کا ذکر ان کے گاؤں کولسر کے تذکرے کے بغیر ادھورا ہے۔ کولسر نہ صرف ان کے نام کا حصہ تھا بلکہ ان کی شخصیت کا بھی لازمی جزو تھا۔ اوکاڑہ چھاؤنی کی تعمیر و توسیع کی غرض سے یہ گاؤں خالی کروا لیا گیا تھا۔ اس ہجرت نے اسلم کولسری کی شخصیت پر بہت گہرے اور انمٹ نقوش چھوڑے۔ کہتے تھے کہ ہندوستان سے جو لوگ ہجرت کر کے آئے تھے ان کا گاؤں تو وہاں موجود تھا مگر وہ بھارت میں، وہاں جا نہیں سکتے تھے، ہمارے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا کہ ہم جا تو سکتے ہیں مگر گاؤں وہاں نہیں رہا۔ ایک بار اُجڑے ہوئے گاؤں میں پہنچا تو گھروں کے مسمار شدہ آثار میں ہوتا ہوا اپنے پرانے گھر تک پہنچ گیا۔ وہاں ایک نیم شکستہ کچی دیوار پر میری ماں نے مٹی کی لیپائی کی ہوئی تھی۔ میری مرحومہ والدہ کا لیپائی کرتے ہوئے ہاتھ کا نشان وہاں باقی رہ گیا تھا۔ میں اس ہاتھ کے نشان سے لپٹ کر دیر تک روتا رہا۔ اپنے گاؤں کولسر کے قصے سناتے ہوئے کہا کرتے کہ اس کا نام تو "محبت پورہ" ہونا چاہیے تھا۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ میری بہن برقعہ پہنے ہوئے اوکاڑہ کے بازار سے گزر رہی تھی کہ کسی بزرگ نے پیچھے سے آواز دی۔ وہ اجنبی آواز سن کر ٹھہر گئی۔ بزرگ میرے والد کا نام لے کر اس سے کہنے لگا کہ تم کیا اس کی بیٹی ہو؟ میری بہن نے اثبات میں سر ہلایا جو کہ اس طرح پردے میں تھی کہ صرف آنکھیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ بزرگ کو اس نے پہچان لیا تھا، بچپن میں اپنے گاؤں میں بہن نے اسے دیکھ رکھا تھا، مگر وہ حیران رہ گئی کہ اس نے پہچانا کیسے؟ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے تمہارے والد کی خوشبو ادھر سے آئی تھی، اس لیے تم سے پوچھ لیا۔

اسلم کولسری کا گاؤں جب اُجڑ گیا، تو پھر اس کی ذات میں بسنے لگا تھا، اس کے نام کا حصہ بن کر تو تاریخ میں بھی زندہ رہے گا۔ ایک بے حس سے نظر آنے والے آدمی کا بتاتے ہیں کہ وہ چھوٹے قد کا نیم برہنہ رہنے والا ایسا آدمی تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس پر کسی غم یا خوشی کا اثر نہیں ہو سکتا۔ سارے جسم پر اس کے بال تھے۔ ساری زندگی اس کو کسی سے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب گاؤں اُجڑ گیا، تو ایک شام کسی اُجڑے مکان سے رونے کی آواز سنائی دی۔ لوگوں نے جا کر اس مکان میں دیکھا تو وہ بے حس نظر آنے والا رحمانامی شخص اپنے گھر میں لگے نیم کے پیڑ سے لپٹ کر زاروقطار رو رہا تھا۔ اسلم کولسری نے ابتدائی زندگی میں مزدوری کی اور ساتھ ساتھ پڑھائی کرتے رہے، یہاں تک کہ ایم اے کر لیا۔ لاہور پہنچ کر صحافت سے منسلک ہو گئے۔ بابا جی اشفاق احمد انھیں اردو سائنس بورڈ لے گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد روزنامہ دنیا جوائن کر لیا۔ ان جیسے بلند پایا اور خوبصورت شاعر ہند، سندھ میں کم کم ہی پیدا ہوئے ہیں۔ مگر منکسر المزاج ایسے کہ خود کو فقط شاعر کہتے ہوئے بھی شرما جاتے۔ ان کی شاعری سے میرا پہلا تعارف کالج فرسٹ ایئر میں اس شعر کے ذریعے ہوا، جو ملک کے دیگر طلباء ہوسٹلز کی طرح ہمارے ہوسٹل میں بھی بے حد مقبول تھا۔

شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

طلبا ہوسٹل میں قیام پذیر لڑکوں کے لیے اس شعر کے ساتھ ذاتی نسبت اور اپنائیت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں دوستوں کا کچھ کہنا ہے کہ وہ زندگی کے ویرانے پر اُمڈنے والی گھنگھور گھٹا اور اس آہستہ خرام بادل کے مانند ہے جو اپنی دھیمی دھیمی کن من سے دھرتی کو ایک طویل عرصے کے لیے اس کی اندرونی پرتوں تک سیراب کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ یہی سیرابی زندگی کے ویرانے کو چمن میں بدلنے کی معجزانہ اہلیت بھی رکھتی ہے۔ ان کی رحلت سے اداس دل یہ اشعار پڑھ کر اور بھی دکھی ہو جاتا ہے۔

سوچ سوالی کر جاتے ہیں صبحیں کالی کر جاتے ہیں
اسلم چھوڑ کے جانے والے آنکھیں خالی کر جاتے ہیں

اسلم کولسری سے مل کر پتا چلتا تھا کہ انسان اتنا نفیس بھی ہو سکتا ہے۔ وہ نہ صرف آدمیت کے معیار پر پورے اُترتے تھے بلکہ ان جیسے لوگوں کو دیکھ کر ہی آدمیت اور انسانیت کا معیار قائم کیا جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

Design By: 0300-4328821 Gull
MUHAMMAD AHSUN